ماہنامہ

قومی زبان

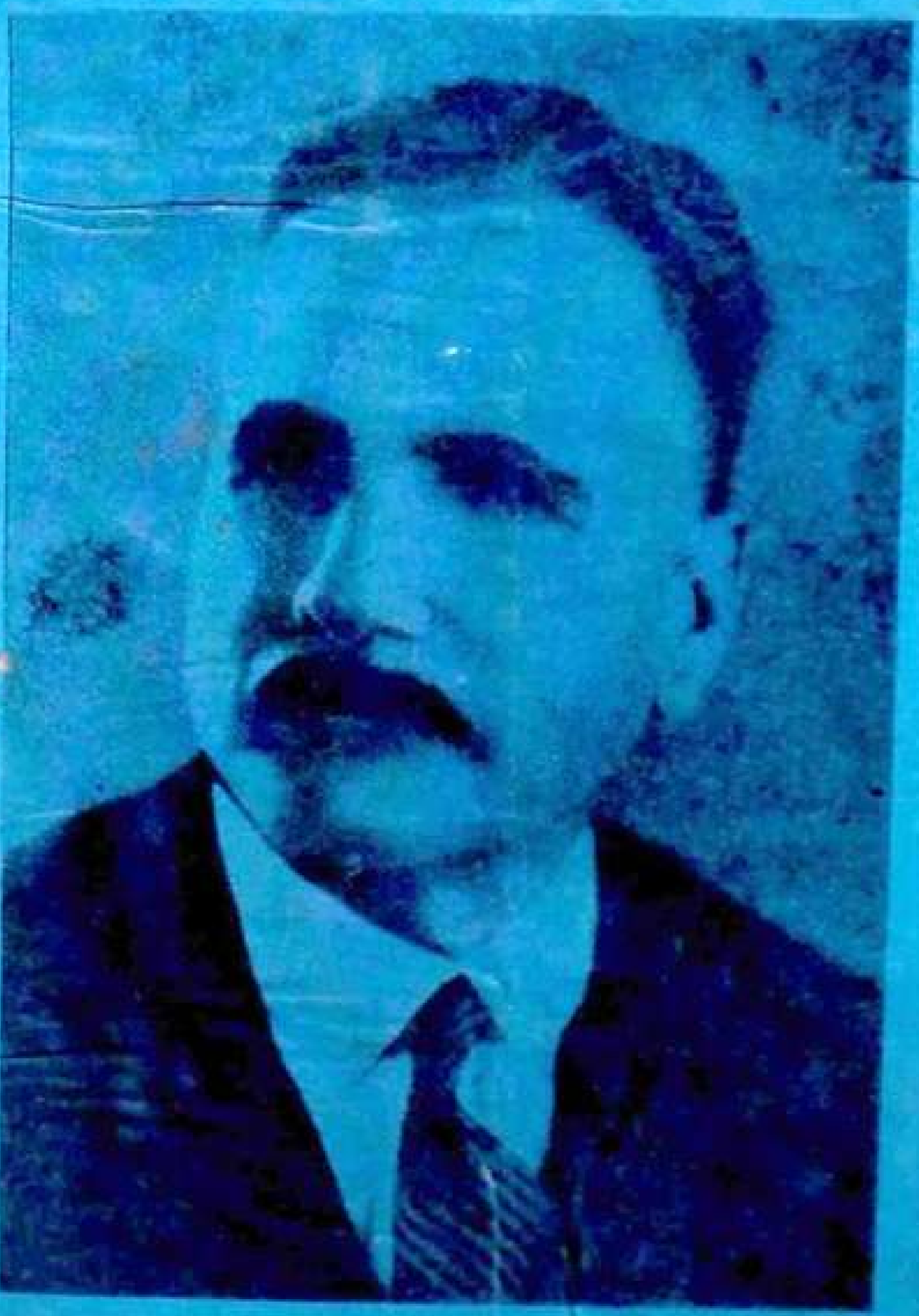

انجمن ترقیِ اردو

بابائے اردو روڈ۔ کراچی

قومی زبان

کراچی

اپریل سنہ ۱۹۷۴ء

جلد ——— ۴۴

شمارہ ——— ۴

ایک پرچے کی قیمت : ایک روپیہ

سالانہ قیمت : دس روپے

انجمن ترقی اردو پاکستان

بابائے اردو روڈ — کراچی

فون : ۲۳۲۷۸۴

فہرست

اداریہ		۳
میلاد النبی	علامہ اقبالؒ	۴
اقبال کے فلسفے میں تضاد و توافق	بشیر احمد ڈار	۶
اقبال نمائش سری نگر	بھگوان ناتھ آزاد	۱۰
اقبال اور سر اکبر حیدری	محمد حبیب اللہ رشدی	۱۵
مسلمانوں کی وحدت کا داعی	ڈاکٹر محمد ریاض	۱۹
اقبال کی شاعری میں انسان کا تصور اور اس کا مقام	نظیر صدیقی	۲۵
اقبال کے خطوط	رفیع الدین ہاشمی	۲۹
اقبال کا حرف شیریں	یونس حسنی	۴۱
علامہ اقبال کا مسلک و تصوف	تنویر کوثر	۴۳
اقبال کا سفر دہلی ۱۹۰۵ء	محمد ایوب قادری	۵۷
پروفیسر حمید احمد خاں	سید سعید احمد	۶۲

ادارۂ تحریر

جمیل الدین عالی
شیخ شبیر علی کاظمی

اداریہ

کسی رسالے یا اخبار کا اقبال نمبر نکالنا ایک خوشگوار ادبی روایت بن گیا ہے۔ خود انجمن ترقی اردو نے لاہور کے رسالے نیرنگ خیال کی قائم کی ہوئی روایت کو آگے بڑھاتے ہوئے ۱۹۳۶ء میں رسالہ "اردو" کا اقبال نمبر شائع کیا تھا، جس میں اہل نظر نے اقبال کے کلام و پیام پر خاص علمی انداز میں روشنی ڈالی تھی، پھر۔ اقبال کے انتقال کے بعد اضافے کے ساتھ اس کا دوسرا ایڈیشن شائع کیا گیا۔ اب تک اس نمبر میں شامل مضامین، حوالے کے طور پر استعمال ہوتے ہیں۔

اس سال ہم نے قومی زبان کے زیر نظر شمارے کو علامہ اقبال کے لیے مخصوص کیا ہے۔ رسالے کی تنگ دامانی کے پیش نظر اسے اقبال نمبر کہتے ہوئے ہمیں ندامت ہوتی ہے، لیکن ہمارا جذبۂ عقیدت ہمارے حوصلے بڑھاتا ہے۔ ہم نے اپنی سعی و جستجو سے جو مضامین فراہم کیے وہ پیش خدمت ہیں۔

ہمارے ملک میں اقبال پرستی کافی حد تک موجود ہے، لیکن صحیح معنے میں اقبال شناسی جو بڑی حد تک ہماری قومی ضرورت ہے، ملک کے معدودے چند لوگوں میں پائی جاتی ہے۔ ان معدودے چند لوگوں میں خود انجمن کی ایک شخصیت شامل تھی جس نے انجمن سے طویل وابستگی کے بعد علیحدگی اختیار کر لی ہے۔ ہماری مراد انجمن ترقی اردو کے سابق مددگار معتمد جناب مشفق خواجہ سے ہے۔ اب جب کہ ہم قومی زبان کا اقبال نمبر مرتب کر رہے ہیں بے ساختہ ان کی یاد آ رہی ہے۔

جناب مشفق خواجہ کے بارے میں انجمن کے معتمد اعزازی نے انجمن کی نئی شائع کردہ کتاب مثنوی نظامی دکنی کے بارے میں اس کی ادب میں اہمیت اور اس کی ترتیب و اشاعت کے مراحل کا تذکرہ کرتے ہوئے تحریر کیا ہے:

> "اس سال انجمن اپنے ایک نہایت ہی مستعد اور فاضل معاون سے محروم ہو رہی ہے اور ان کی ایک خصوصیت یہ بھی تھی کہ انھوں نے اپنا نام انجمن کی کسی اشاعت کے دیباچے تک میں نہیں آنے دیا۔ مگر اب کہ یہ سطریں لکھی جا رہی ہیں۔ وہ انجمن کے کارکن نہیں ہیں۔ سبک دوش ہو کر تصنیف و تالیف کرنے لاہور چلے گئے ہیں۔ اس لیے ہم ان کا ذکر کرنے کے لیے آزاد ہیں، یہ کارکن انجمن کے سابق مددگار معتمد جناب مشفق خواجہ ہیں۔ مشہور محقق اور ناقد اور شاعر بھی۔ ان کے فضائل اور خدماتِ جلیلہ کا ذکر مناسب موقع پر آئے گا۔ اس وقت اس کتاب کے ناتے سے یہ عرض کرنا ہے کہ مولوی صاحب (بابائے اردو) کی یہ خواہش اور وصیت پوری کرنے کے لیے سب سے زیادہ کاوش اور محنت مشفق خواجہ صاحب نے کی ہے، ہم نے نہیں۔ ڈاکٹر جمیل جالبی کو یہ سخت مرحلہ طے کرنے کی تشویق و ترغیب بھی مشفق خواجہ نے دلائی۔"

بہرحال مشفق خواجہ کے تذکرے کا یہ موقع نہ تھا، لیکن جب انجمن کے اشاعتی مسائل ہمیں ستائیں گے تو ان کی یاد ضرور آئے گی۔

ہمارا خیال تھا کہ اس سال حکیم الامت علامہ اقبال کے صد سالہ تقریب پیدائش پر سہ ماہی اردو کا خصوصی اقبال نمبر شائع کریں اور اس کے لیے اہل قلم حضرات سے مضامین بھیجنے کی درخواست کی تھی۔ لیکن اب صد سالہ تقریب ۱۹۷۶ء میں ہوگی۔ اس طرح ہمیں مضامین فراہم کرنے کے لیے کافی وقت مل گیا ہے۔ انشاء اللہ جشن صد سالہ پر حکیم الامت کے شایان شان خراج عقیدت پیش کرنے کی کوشش کریں گے۔ ارباب قلم سے اعانت کی استدعا ہے۔

میلاد النبیؐ

علامہ اقبالؒ

(یہ تقریر علامہ اقبال نے لاہور میں میلاد النبیؐ کے جلسے کی صدارت کرتے ہوئے فرمائی تھی)

زمانہ ہمیشہ بدلتا رہتا ہے۔ انسانوں کی طبائع، ان کے افکار اور ان کے نقطہ ہائے نگاہ بھی زمانے کے ساتھ ہی بدلتے رہتے ہیں۔ لہٰذا تہوار منانے کے طریقے اور مراسم بھی ہمیشہ متغیر ہوتے رہتے ہیں اور اِن کے استفادے کے طریق بھی بدلتے رہتے ہیں ہمیں چاہیئے کہ ہم بھی اپنے مقدس مراسم پر غور کریں اور جو تبدیلیاں افکار کے تغیر سے ہوئی لازم ہیں ان کو مدِ نظر رکھیں۔

منجملہ ان مقدس ایام کے جو مسلمانوں کے لیے مخصوص کیے گئے ہیں ایک میلاد النبیؐ کا مبارک دن بھی ہے۔ میرے نزدیک انسانوں کی دماغی اور قلبی تربیت کے لیے نہایت ضروری ہے کہ ان کے عقیدے کی رو سے زندگی کا جو نمونہ بہترین ہو وہ ہر وقت ان کے سامنے رہے۔ چنانچہ مسلمانوں کے لیے اسی وجہ سے ضروری ہے کہ وہ اسوۂ رسولؐ کو مدِ نظر رکھیں تاکہ جذبۂ تقلید اور جذبۂ عمل قائم رہے۔ ان جذبات کو قائم رکھنے کے تین طریقے ہیں۔ پہلا طریقہ تو درود و صلوٰۃ ہے جو مسلمانوں کی زندگی کا جزو لاینفک ہو چکا ہے۔ وہ ہر وقت درود پڑھنے کے موقعے نکالتے ہیں۔ عرب کے متعلق میں نے سنا ہے کہ اگر کہیں بازار میں دو آدمی لڑ پڑتے ہیں اور تیسرا باآواز بلند **اللھم صل علی سیدنا محمد و بارک وسلم** پڑھ دیتا ہے تو لڑائی فوراً رک جاتی ہے اور متخاصمین ایک دوسرے پر ہاتھ اٹھانے سے فوراً باز آجاتے ہیں۔ یہ درود کا اثر ہے اور لازم ہے کہ جس پر درود پڑھا جائے اس کی یاد قلوب کے اندر اپنا اثر پیدا کرے۔

پہلا طریق انفرادی، دوسرا اجتماعی ہے۔ یعنی مسلمان کثیر تعداد میں جمع ہوں اور ایک شخص جو حضور آقائے دوجہاں صلی اللہ علیہ وسلم کے سوانح حیات سے پوری طرح باخبر ہو، آپ کے سوانح زندگی بیان کرے، تاکہ ان کی تقلید کا ذوق و شوق مسلمانوں کے قلوب میں پیدا ہو۔ اسی طریق پر عمل پیرا ہونے کے لیے ہم سب آج یہاں جمع ہوئے ہیں۔

تیسرا طریقہ اگرچہ مشکل ہے لیکن بہرحال اس کا بیان کرنا نہایت ضروری ہے۔ وہ طریقہ یہ ہے کہ یادِ رسولؐ اس کثرت اور ایسے انداز میں کی جائے کہ انسان کا قلب نبوت کے مختلف پہلوؤں کا خود مظہر ہو جائے یعنی آج سے تیرہ سو سال پہلے جو کیفیت حضور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کے وجود مقدس سے ہویدا تھی، وہ آج ہمارے قلوب کے اندر پیدا ہو جائے۔ حضرت مولانا روم فرماتے ہیں۔

آدمی دیدست باقی پوست است　　دید آن است آنکہ دید دوست است

یہ جوہرِ انسانی کا کمال ہے کہ اسے دوست کے سوا اور کسی چیز کی دید سے مطلب نہ رہے یہ طریقہ بہت مشکل ہے۔ کتابیں پڑھنے یا میری تقریر سننے سے نہیں آئے گا۔ اس کے لیے کچھ مدت نیکوں اور بزرگوں کی صحبت میں بیٹھ کر روحانی انوار حاصل کرنا ضروری ہے۔ اگر یہ میسر نہ ہو تو پھر ہمارے لیے یہی طریقہ غنیمت ہے جس پر عمل پیرا ہیں۔

اب سوال یہ ہے کہ اس طریق پر عمل کرنے کے لیے کیا کیا جائے۔ پچاس سال سے ایک شور برپا ہے کہ مسلمانوں کو تعلیم حاصل کرنی چاہیئے

لیکن جہاں تک میں نے غور کیا ہے تعلیم سے زیادہ اس قوم کی تربیت ضروری ہے اور ملی اعتبار سے یہ تربیت علما کے ہاتھ میں ہے۔ اسلام ایک خالص تعلیمی تحریک ہے۔ صدر اسلام میں اسکول نہ تھے، کالج نہ تھے، یونیورسٹیاں نہ تھیں۔ لیکن تعلیم و تربیت اس کی ہر چیز میں ہے۔ خطبۂ جمعہ، خطبۂ عید، حج، وعظ غرض تعلیم و تربیتِ عوام کے بے شمار مواقع اسلام نے بہم پہنچائے ہیں لیکن افسوس کہ علما کی تعلیم کا کوئی صحیح نظام قائم نہ تھا۔ اور اگر کوئی رہا بھی تو اس کا طریقِ عمل ایسا رہا کہ دین کی حقیقی روح نکل گئی۔ جھگڑے پیدا ہو گئے اور علما کے درمیان جنھیں پیغمبر علیہ السلام کی جانشینی کا فرض ادا کرنا تھا، سر پھٹول ہونے لگی۔ مصر، عرب، ایران، افغانستان ابھی تہذیب و تمدن میں ہم سے پیچھے ہیں۔ لیکن وہاں علما ایک دوسرے کا سر نہیں پھوڑتے۔ وجہ یہ ہے کہ اسلامی ممالک نے اخلاق کے اس اعلیٰ معیار کو پالیا ہے جس کی تکمیل کے لیے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام مبعوث ہوئے تھے اور ہم ابھی اس معیار سے دور ہیں۔

دنیا میں نبوت کا سب سے بڑا کام تکمیلِ اخلاق ہے چنانچہ حضورؐ نے فرمایا بعثت لاتمم مکارم الاخلاق یعنی میں نہایت اعلیٰ اخلاق کے اتمام کے لیے بھیجا گیا ہوں، اس لیے علما کا فرض ہے کہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاق ہمارے سامنے پیش کیا کریں تاکہ ہماری زندگی حضورؐ کے اسوۂ حسنہ کی تقلید سے خوشگوار ہو جائے اور اتباعِ سنت زندگی کی چھوٹی چھوٹی چیزوں تک جاری و ساری ہو جائے۔ حضرت بایزید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ کے سامنے خربوزہ لایا گیا تو آپ نے کھانے سے انکار کر دیا اور کہا کہ مجھے معلوم نہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو کس طرح کھایا مبادا میں ترکِ سنت کا مرتکب ہو جاؤں ؎

کامل بسطام در تقلید فرد　　اجتناب از خوردن خربوزہ کرد

افسوس کہ ہم میں بعض چھوٹی چھوٹی باتیں بھی نہیں ہیں جن سے ہماری زندگی خوشگوار ہو اور ہم اخلاق کی فضا میں زندگی بسر کر کے ایک دوسرے کے لیے باعث رحمت ہو جائیں۔ اگلے زمانے کے مسلمانوں میں اتباعِ سنت سے ایک اخلاقی ذوق اور ملکہ پیدا ہو جاتا تھا۔ اور وہ ہر چیز کے متعلق خود ہی اندازہ کر لیا کرتے تھے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا رویہ اس چیز کے متعلق کیا ہوگا۔ حضرت مولانا رومؒ بازار جا رہے تھے۔ آپ کو بچوں سے بہت محبت تھی۔ کچھ بچے کھیل رہے تھے ان سب نے مولانا کو سلام کیا اور مولانا ایک ایک کا سلام الگ الگ قبول کرنے کے لیے دیر تک کھڑے رہے ایک بچہ کہیں دور کھیل رہا تھا۔ اس نے وہیں سے پکار کر کہا حضرت ابھی جایئے گا نہیں۔ میرا سلام لیتے جایئے، تو مولانا نے بچے کی خاطر دیر تک توقف فرمایا اور اس کا سلام لے کر گئے۔ کسی نے پوچھا۔ حضرت آپ نے بچے کے لیے اس قدر توقف کیا۔ آپ نے فرمایا کہ اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس قسم کا واقعہ پیش آتا تو حضورؐ بھی یونہی کرتے۔

گویا ان بزرگوں میں تقلیدِ رسولؐ اور اتباعِ سنت سے ایک اخلاقی ذوق پیدا ہو گیا تھا۔ اس طرح کے بے شمار واقعات ہیں۔ علما کو چاہیئے کہ ان کو ہمارے سامنے پیش کریں۔ قرآن و حدیث کے غوامض بتانا بھی ضروری ہیں۔ لیکن عوام کے دماغ ابھی ان مطالب عالیہ کے متحمل نہیں۔ انھیں فی الحال اخلاقِ نبویؐ کی تعلیم دینی چاہیئے۔

(صوفی۔ اکتوبر ۱۹۲۶ء)

اقبال کے فلسفے میں تضاد و توافق

بشیر احمد ڈار

اس عنوان کے تحت کچھ عرصہ ہوا "ماہ نو" کے ایک پرچے میں میرا ایک مضمون شائع ہوا تھا جس میں اس حقیقت کی طرف اشارہ اشارہ کیا گیا تھا کہ اقبال کے کلام میں بے شمار ایسے تصورات کارفرما ہیں جو بظاہر متضاد مفہوم کے حامل ہیں مثلاً عقل و عشق، ذکر و فکر، جلال و جمال، قاہری و دلبری، مشرق و مغرب، خلوب و جلوت وغیرہ لیکن اگر غور کیا جائے تو اقبال کے فکر کا ایک بنیادی پہلو یہی ہے کہ ان متضاد تصورات میں ایک ہم آہنگی، توافق اور یگانگت پیدا کی جائے جس سے ایک بہترین سیرت کی تشکیل عمل میں آسکے جن میں ان دونوں اجزا کا متناسب دخل ہو۔

مثلاً بعض لوگوں کا کہنا ہے کہ اقبال محض مشرق کا شاعر ہے، اس کا پیغام صرف مشرق کے مکینوں کے لیے ہے۔ اس نے مغرب کے خلاف بہت کچھ لکھا ہے اور ہر جگہ اور ہر وقت مشرق والوں کو مغرب والوں کے خلاف بغاوت پر ابھارا ہے۔ یہ الزام اس طرح غلط ہے جس طرح بعض لوگ اقبال پر خرد دشمنی کا الزام لگاتے ہیں۔ اقبال کے کلام میں مشرق اور مغرب دونوں کے خلاف مواد موجود ہے۔ اس طرح جس طرح ملّا صوفی و فقیہ و شاعر و فلسفی کے خلاف جگہ جگہ طنز کے نشتر ملتے ہیں۔ اقبال کے فکر کی یہی خوبی ہے کہ وہ صوفی کے خلاف لکھتا ہے لیکن تصوف کے خلاف نہیں۔ فلسفی کے خلاف اشعار آپ آسانی سے اکٹھے کر سکتے ہیں لیکن وہ خود بنیادی طور پر فلسفی ہے۔ وہ مغرب کے خلاف ہے چونکہ مغرب کے طرز فکر کے باعث انسانیت کے بلند مقاصد مجروح ہو رہے ہیں۔ وہ مشرق کے خلاف ہے کیونکہ ان کی طرز زندگی ان مقاصد کے حصول میں سدّ راہ بن رہی ہے۔

ضرب کلیم (صفحہ ۱۰۵) میں ایک نظم "شعاع امید" ہے۔ اس میں بے مہری ایام کا شدید گلہ کرتے ہوئے سورج کی شاعیں پریشان ہو کر سورج سے تشفی کی متوقع ہیں۔ سورج انہیں مشورہ دیتا ہے کہ تم اس تلخ دنیا کو چھوڑ کر پھر میرے تجلی کدۂ دل میں سما جاؤ۔ ان شکایات کو یوں ادا کیا جاتا ہے۔

اک شور ہے مغرب میں اجالا نہیں ممکن — افرنگ مشینوں کے دھوئیں سے سیہ پوش
مشرق نہیں گو لذت نظارہ سے محروم — لیکن صفت عالم لاہوت ہے خاموش

لیکن اسی سورج کی ایک کرن، جوہر سیماب سے آراستہ اور شوخ مثال نگہ حور تڑپ اٹھتی ہے۔ وہ اس یاس و ناامیدی کے موت

لہ اس محولہ بالا مضمون میں صرف خلوت و جلوت پر بحث کی گئی تھی۔

بھرے پیغام کو ٹھکرا دیتی ہے۔ وہ فوراً پکار اٹھتی ہے کہ ہمارا کام تاریکی میں روشنی پھیلانا ہے، ہمارے لیے مشرق و مغرب کی تقسیم لایعنی ہے۔

مشرق سے ہو بیزار نہ مغرب سے حذر کر　　　فطرت کا اشارا ہے کہ ہر شب کو سحر کر

اور یہ تاریکی — ظلمت و شر کی تاریکی — مشرق و مغرب دونوں جگہ موجود ہے، اس میں نہ مغرب کی تخصیص ہے اور نہ مشرق کی۔ علم و نور و ہدایت اگر ضروری ہیں تو دونوں جگہ ان کی ضرورت ہے۔ اگر فرق ہے تو صرف یہ کہ ایک جگہ ظلمت ایک خاص شکل میں نمایاں ہیں تو دوسری جگہ یہ گمراہی دوسری شکل اختیار کیے ہوئے ہے۔

یہاں مرض کا سبب ہے غلامی و تقلید　　　وہاں مرض کا سبب ہے نظام جمہوری

نہ مشرق اس سے بری ہے نہ مغرب اس سے بری　　　جہاں میں عام ہے قلب و نظر کی رنجوری

پیام مشرق جب شائع ہوئی تو اس کے سرورق پر سب سے اوپر قرآن حکیم (۲، ۱۴۲) کی آیت درج تھی کہ "مشرق و مغرب دونوں اللہ کے ہیں اور اسی روح یکجائی کا مظہر مندرجہ ذیل شعر ہے:۔

درویش خدامست نہ شرقی ہے نہ غربی　　　گھر میرا نہ دلی نہ صفاہاں نہ سمرقند

ہمارا صوفیانہ ادب اس قسم کے متضاد تصورات سے پوری طرح آشنا ہے۔ لیکن مختلف کتابوں میں جو ان تصورات پر بحث کی گئی ہے بد قسمتی سے ان تصورات کی باہمی آمیزش سے ایک بہتر اور بلند تر منزل کا تصور ان میں کہیں نہیں ملتا۔ آپ مثلاً صحو و سکر کی بحث کو لیجیے۔ کشف المحجوب[1] میں ان احوال پر سیر حاصل بحث کی گئی ہے۔ علی ہجویریؒ کا مسلک یہ ہے کہ صحو کا طریقہ جو حضرت جنید کی پیروی میں اختیار کیا گیا ہے، سکر کے طریقے سے افضل و اعلیٰ ہے۔ اگرچہ بحث کا خلاصہ بیان کرتے وقت انھوں نے کوشش کی ہے کہ ان کا باہمی ربط بیان کیا جائے، تاہم وہ اپنے ابتدائی مسلک پر قائم ہیں کہ صحو کا طریقہ افضل ہے۔ اسی طرح علامہ قشیری کے رسالہ[2] میں صحو و سکر پر بحث بالکل اسی نوعیت کی ہے۔ دونوں کا فرق بیان کیا گیا ہے اور کسی جگہ بھی یہ تاثر نہیں دیا گیا کہ یہ دونوں حالتیں مساوی طور پر اہم ہیں اور ہر شخص ان دونوں حالتوں سے گزرتا ہے۔ یہی معاملہ قبض۔ بسط اور فنا و بقا کا ہے۔ ان کتابوں میں عام طور پر یہی بیان کیا جاتا ہے کہ یہ احوال متضاد حالتوں کا اظہار ہیں اور لوگ اس نقطۂ نگاہ سے مخالف گروہوں میں منقسم ہیں۔ مثلاً شیخ سہروردیؒ عوارف المعارف[3] میں فرماتے ہیں کہ سکر کا تعلق اہل دل سے ہے اور صحو انھیں حاصل ہوتا ہے جن پر غیبی حقائق منکشف ہو جاتے ہیں حالانکہ اگر غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ یہ احوال ایک ہی شخص پر مختلف وقتوں میں وارد ہو سکتے ہیں۔ انسان کی شخصیت کی تعمیر و تشکیل میں صحو و سکر، قبض و بسط، فنا و بقا، عقل و عشق، جمال و جلال دونوں اثر انداز ہوتے رہتے ہیں۔

اس طرح کا ایک جوڑا نظر و خبر ہے۔ یہ دونوں اپنے مفہوم و تقاضے کے لحاظ سے متضاد ہیں۔ خبر سے مراد وہ علم ہے جو حواس

---

[1] کشف المحجوب (اردو ترجمہ)، فیروز سنز، ۱۹۶۷، ۲۸۳ - ۲۸۶

[2] رسالہ قشیریہ (اردو ترجمہ) ادارہ تحقیقات اسلامی، ۱۹۷۰، صفحہ ۱۲۸ - ۱۳۰

[3] عوارف المعارف (اردو ترجمہ) شیخ غلام علی سنز، ۱۹۶۵، ۵۹۹

کی بجائے قلب کی وساطت سے حاصل کیا جائے۔ یہ تضاد بھی دوسروں کی طرح ہمارے صوفیانہ ادب میں زیر بحث آچکا ہے البتہ جن مصطلحات کے ذریعے ان مسائل پر بحث ہوتی رہی وہ عموماً مختلف تھیں۔ مثلاً عوارف المعارف میں یہ بحث سلوک و جذب کے تحت ملتی ہے۔ شیخ سہروردیؒ نے مشائخ کی مختلف قسمیں بیان کرتے ہوئے فرمایا ہے کہ محض سالک اور محض مجذوب لوگوں کی راہنمائی کے لائق نہیں۔ البتہ سالک مجذوب اور مجذوب سالک اس اہم فرض کو بہتر طریقے سے سرانجام دے سکتے ہیں۔ سلوک سے مراد اکتساب کا وہ راستہ ہے جسے ہم علم یا خبر کہتے ہیں اور جذب سے مراد اکتساب کا وہ راستہ ہے جسے ہم رومی اور اقبال کی اصطلاح میں نظر کہتے ہیں۔ شیخ سہروردی کی رائے ہے کہ بہترین استاد وہ ہے جو جذب کے راستے سے ہو کر سلوک کی منزل پر پہنچے یعنی جو قلت کی دولت سے پہلے مزین ہو اور علم کی دولت بعد میں حاصل کرے[1]۔ امام غزالی کی رائے اس معاملے میں مختلف ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ وہ شخص جو علم کا اکتساب کرتا ہے اور اس کے بعد اسے جذب کا مقام حاصل ہوتا ہے، وہ ایک بہتر انسان ہے جو دین اور دنیا دونوں کے تقاضوں سے بہتر طریقے سے عہدہ برآ ہو سکتا ہے[2]۔

اقبال کا خیال ہے کہ خبر اور نظر دونوں ضروری ہیں لیکن جب تک انسان "نظر" کی برکتوں سے بہرہ یاب نہیں ہوتا اس کا علم صحیح معنوں میں بارآور نہیں ہو سکتا۔ اقبال نے کبھی بھی علم بذریعہ حواس کو برا نہیں جانا بلکہ اس نے تو انسانی خودی کی تربیت کے لیے اسے ضروری گردانا ہے لیکن آدم کی آخری منزل نہیں۔ اس علم کی بنیاد پر ہی، اس کی مدد سے ہی انسان کو ایک قدم اور بڑھانا چاہیے لیکن یہ قدم اس طرح اکتسابی نہیں جس طرح علم حواس۔ اس کے لیے "صحبت مرد" کی ضرورت ہے، اس کے لیے دل کے خفیہ سوتوں کو کھول دینے کی ضرورت ہے۔ اقبال نے اسی قدم کو "رقص جان" سے تعبیر کیا ہے۔

رقص تن در گردش آرد خاک را — رقص جاں برہم زند افلاک را
علم و حکم از رقص جاں آید بدست — ہم زمیں ہم آسماں آید بدست
فر دازوے صاحب جذب کلیم — ملت ازوے وارث ملک عظیم

جسم کے رقص سے خاک کی گردش سے زیادہ کچھ حاصل نہیں ہوتا۔ رقص جاں سے کائنات پر حکمرانی حاصل ہوتی ہے۔ اس کا نتیجہ علم بھی ہے اور حکم بھی اور یہ علم اور حکم وہی ہے۔ بقول قرآن حکیم انبیاء کو حاصل ہوتا ہے۔

وہ علم جو حواس کے ذریعے سے حاصل ہوتا ہے ایک کارآمد اور فائدہ مند شے ہے لیکن جب تک اس کی تکمیل "نظر" سے نہ کی جائے وہ بارآور نہیں ہوتا[3]۔ اسی لیے اقبال کہتے ہیں کہ :-

علم اگر کج نظرت و بد گوہر است — پیش چشم ما حجاب اکبر است
علم را مقصود اگر باشد نظر — می شود ہم جادہ و ہم راہبر

---

[1] دیکھیے عوارف المعارف، صفحہ ۱۲۹ ومابعد۔ صفحہ ۸۴ ومابعد

[2] احیاء العلوم الدین (اردو ترجمہ) جلد اول، باب اول، حصہ ۲، صفحہ ۳۰۔ ۳۱

[3] ان مباحث کی تفصیل کے لیے دیکھیے اسرار و رموز صفحہ ۱۲۵۔ ۱۲۶، جاوید نامہ ۴۔ ۵، ۱۶۔ ۱۷ وغیرہ

یعنی علم اگر انسانوں کی بھلائی اور سماج کے تقاضوں کو نظر انداز کردے تو اس کا نتیجہ ہم سب کے لیے ہولناک ہوگا، وہ فلاح اور بہتری کی طرف راہنمائی کرنے کی بجائے ظلمت و سرکشی و تمرد کی طرف لے جائے گا وہ حقیقت کا انکشاف کرنے کی بجائے حجاب اکبر کا کردار ادا کرے گا۔ لیکن اگر یہی علم عقل و خرد کی تنگ دامانی سے باہر نکل کر قلب و نظر سے رابطہ پیدا کرے تو یہی انسانیت کے دکھوں کا مداوا ہوجاتا ہے۔ لیکن یہ بلند تر مقام تبھی حاصل ہوتا ہے، جب انسان نظر و خبر دونوں سے پوری طرح آشنا ہو۔ نہ محض علم و خرد سود مند ہیں الا نہ محض قلب و نظر۔

اس خبر و نظر کو کبھی اقبال نے علم و فقر کے ناموں سے بھی پیش کیا ہے۔ مثلاً بال جبریل میں فرماتے ہیں۔

علم کا مقصود ہے پاکیٔ عقل و خرد　　فقر کا مقصود ہے عفت قلب و نگاہ
علم فقیہ و حکیم، فقر مسیح و کلیم　　علم ہے جویائے راہ، فقر ہے دانائے راہ

بال جبریل میں مرید ہندی پیر رومی سے سوال کرتا ہے کہ غایت آدم خبر ہے یا نظر؟ پیر رومی جواب دیتا ہے:

آدمی دید است باقی پوست است　　دید آں باشد کہ دید دوست است

یہی سوال جہاں دوست اور زندہ رود کے درمیان پیدا ہوتا ہے۔

گفت ایں علم و ہنر؟ گفتم کہ پوست　　گفت حجت چیست؟ گفتم روئے دوست[۲]

"دید دوست" سے مراد وہی ہے شیخ سہروردیؒ نے جذب کہا ہے اور جسے اقبال کی اصلاح میں عشق و جنون و فقر و رقص جاں کہا جاتا ہے۔ یہ علم ہی کے راستے کی آخری منزل ہے۔ اس کی نمایاں مثال مہاتما بدھ اور امام غزالی کے ذاتی تجربات میں نظر آتی ہے۔ جب مدتوں کی کوششوں کے بعد مہاتما بدھ کو یہ مرتبہ حاصل ہوا تو ان کے قلب میں ایک نور روشن ہوا۔ اسی طرح امام غزالی نے اس بات کی تصدیق کی ہے کہ مجاہدات کی کٹھن منزل کے بعد ان کا دل نور سے مزین ہوا اور یہ نور نور نبوت ہی سے حاصل ہوا۔[۳] مرد کامل وہ ہے جو اس دیدار ذات سے مستفید ہوتا ہے۔

چشم او روشن شود از کائنات　　تا ببیند ذات را اندر صفات
ہر کہ عاشق شد جمال ذات را　　اوست سید جملہ موجودات را

۱۔ بال جبریل، ۱۸۴

۲۔ جاوید نامہ، ۳۷

۳۔ سرگزشت غزالی (اردو ترجمہ) ۱۹۶۹، صفحہ ۱۶۰ و ما بعد

اقبال نمائش، سری نگر

جگن ناتھ آزاد

سری نگر میں اقبال نمائش منعقد کرنے کا خیال سب سے پہلے ڈاکٹر محمد حسن، صدر شعبۂ اردو کشمیر یونیورسٹی کے دل میں آیا۔ ہوا یوں کہ جب سالِ رواں کے شروع میں کشمیر یونیورسٹی نے ہفتۂ اقبال منانے کا پروگرام بنایا تو ڈاکٹر محمد حسن نے اقبال نمائش کو بھی ایک جزو کے طور پر تقریروں اور مقالات کے علاوہ اس میں شامل کیا اور اس سلسلے میں انھوں نے میرے ساتھ بات کی۔ میں نے اس تجویز کی تائید کرتے ہوئے کہا کہ جہاں پروگرام کے باقی حصے ایسے ہیں جن پر زیادہ محنت کرنے کی ضرورت نہیں وہاں نمائش ایک ایسا کام ہے جس کے لیئے چند دنوں کی نہیں بلکہ کئی مہینوں کی محنت درکار ہے۔ انھیں معلوم تھا کہ میرے پاس اقبال کی تصویروں اور تحریروں کا خاصا ذخیرہ موجود ہے لیکن غالباً وہ اس خیال سے خالی الذہن تھے کہ یہ تمام تصویریں اور تحریریں موجودہ صورت میں اس ادبی کارنامے کے شایانِ شان نہیں ہیں جسے ہم اقبال نمائش کے نام سے پیش کر سکیں۔ ان تصویروں اور تحریروں کو بڑے سائز میں بنانا، ان پر مناسب عنوانات جلی قلم سے لکھوانا، انھیں ماؤنٹ کر کے الگ الگ پینل پر سجانا ایک محنت طلب اور وقت طلب کام تھا۔ اس کے علاوہ چونکہ میرے ذخیرے کا ایک خاصا حصہ دہلی سے میری غیر حاضری کے باعث دیمک کی نذر ہو چکا تھا اس لیے اس کمی کو پورا کرنے کے لیئے ملک کے مختلف حصوں سے ان تصویروں کو حاصل کرنے کی کوشش ضروری تھی۔ تب کہیں جا کے ٹوٹی ہوئی کڑیاں جڑ سکتی تھیں اور ہم ایک تاریخ وار صورت میں حیاتِ اقبال کے مختلف گوشے اہلِ نظر کی خدمت میں پیش کر سکتے تھے۔

ڈاکٹر محمد حسن نے یہ ساری صورتِ حال کشمیر یونیورسٹی کے وائس چانسلر خواجہ نورالدین (مرحوم) کے سامنے رکھی۔ انھوں نے حکومتِ ہند کے منسٹرِ اطلاعات و نشریات جناب اندر کمار گجرال سے بات کی۔ گجرال صاحب نے انور جمال صاحب قدوائی سے مشورہ کیا اور یہ طے پایا کہ میں اس نمائش کا ایک مختصر سا خاکہ بنا کے پیش کروں۔

اس خاکے کی موجودگی میں قدوائی صاحب کے ساتھ مفصل بحث ہوئی۔ انھوں نے خاصے گراں قدر مشورے اس سلسلے میں دیئے اور فرمایا کہ اقبال کے اشعار کی مصوری والا حصہ عبدالرحمن چغتائی کی نمائندگی کے بغیر نامکمل رہے گا چنانچہ میں نے نقشِ اقبال[1] کی تلاش شروع کی لیکن بدقسمتی سے ان تین تصویروں کے علاوہ جو اس نمائش میں شامل ہیں اور کچھ نہ مل سکا۔

---

[1] نقشِ اقبال غالباً یورپ میں چھپی ہے۔ پانچ ہزار روپے ایک جلد کی قیمت ہے جب یہ چھپی تھی تو پاکستان سے چغتائی صاحب نے ازراہِ عنایت اس کا ایک ورق مجھے تحفۃً بھیجا تھا جو میری بدقسمتی سے میری چھ ہزار کتابوں کے ساتھ دہلی میں تلف ہو گیا۔

اقبال صدی تقاریب، حیدر آباد

انہی دنوں مجھے حیدرآباد میں اقبال صدی تقاریب میں شرکت کا موقع ملا۔ یہ تقاریب اقبال اکیڈیمی حیدرآباد کے زیرِ اہتمام منائی گئیں اور اقبالیات کی نمائش ان تقاریب کا ایک خاص جزو تھا۔ میں یہ نمائش دیکھ کر بے حد متاثر ہوا۔ اقبال پر لکھی ہوئی کتابوں کا ایک نادر ذخیرہ اس نمائش میں ہر خاص و عام کو دعوتِ نظر دے رہا تھا۔ تصاویر بھی خاصی تعداد میں موجود تھیں لیکن یہ تصاویر اقبال کی زندگی کو تاریخ وار پیش نہیں کر رہی تھیں۔ اکثر اہم کڑیاں اس سلسلے سے غائب تھیں۔ اقبال کے خطوط بھی تھے لیکن زیادہ تر وہی جو انھوں نے حیدرآباد کے ادباء اور اہلِ قلم کو لکھے تھے۔ کوئی چالیس کے قریب اقبال کے اشعار بھی مصوری کی صورت میں موجود تھے اور یہ سب تصویریں حیدرآباد کے مصوروں کی بنائی ہوئی تھیں۔ میں نے اس ذخیرے میں سے جو بعض نوادر سری نگر کی اقبال نمائش کے لیے منتخب کیے سو سید خلیل اللہ صاحب حسنی، پرنسپل انوار العلوم کالج حیدرآباد اور برادرِ محترم عابد علی خان، مدیر "سیاست" حیدرآباد کی عنایت سے فوراً مجھے حاصل ہو گئے۔ چنانچہ ان نوادر کی بدولت میں نے کشمیر یونیورسٹی کی اقبال نمائش میں ایک گوشہ "حیدرآباد میں اقبال نمائش" کے نام سے شامل کر لیا اور یہ شعبہ آج ہماری اقبال نمائش کا ایک اہم شعبہ ہے۔

عبدالرشید عمادی صاحب کے نام علامہ اقبال کے مکتوب کا نیگیٹو مجھے جناب عابد علی خان کے فرزند عزیز محترم زاہد علی خان نے عنایت کیا لیکن بدقسمتی سے وہ کہیں ادھر ادھر ہو گیا اور اصل خط سے دوبارہ اس کا نیگیٹو تیار کرانا پڑا۔

یہاں مسٹر جی وامن راؤ، ڈائرکٹر انفارمیشن ڈیپارٹمنٹ، آندھرا پردیش کا شکریہ ادا نہ کرنا میرا احسان فراموشی ہوگی جن کی توجہ سے مذکورہ نادر تصویروں اور تحریروں کے نیگیٹو مجھے بآسانی حاصل ہو گئے ؎

سفر ہے شرط مسافر نواز بہتیرے
ہزارہا شجرِ سایہ دار راہ میں ہے

علی گڑھ، پٹنہ، رام پور

انعقادِ نمائش کا شوق حیدرآباد سے مجھے پٹنے لے گیا جہاں ڈاکٹر عابد رضا بیدار کی بدولت میں نے خدا بخش لائبریری کے نوادر سے پوری طرح فائدہ اٹھایا۔ جناب ایم۔ این۔ جہا، ڈائرکٹر پبلک ریلیشنز ڈیپارٹمنٹ حکومتِ بہار نے مجھ پر خاص کرم فرمائی کی اور مطلوبہ نوادر کے نیگیٹو بہت کم وقت میں بنوا کے مجھے دے دیے۔ میں جہا صاحب کی اس عنایت کے لیے ان کا تہِ دل سے شکرگزار ہوں۔

پٹنے سے میں لکھنؤ آیا۔ خیال تھا لکھنؤ یونیورسٹی سے میں بہت کچھ حاصل کر سکوں گا لیکن وہاں پہنچتے ہی معلوم ہوا کہ لکھنؤ یونیورسٹی میں فساد ہو گیا ہے اور یونیورسٹی کی اکثر عمارتوں سے آگ کے شعلے بلند ہو رہے ہیں۔ میں ایک آدھ دن لکھنؤ میں رکا لیکن یونیورسٹی تک رسائی نہ ہو سکی چنانچہ میں وہاں سے خالی ہاتھ واپس لوٹا۔

اس سفر میں میری اگلی منزل علی گڑھ یونیورسٹی تھی۔ وہاں پروفیسر آلِ احمد سرور اور رضوی صاحب کی عنایت سے ہفتوں کا کام دنوں میں مکمل ہو گیا۔ یہی لطف و کرم مولینا امتیاز علی عرشی اور ان کے فرزند عرشی زادہ کی طرف سے رضا لائبریری رام پور میں میرا منتظر تھا۔ ان تمام حضرات کے بارے میں جن کی توجہ میری مشکل کو آسان بناتی چلی گئی بس یہی کہہ سکتا ہوں کہ ؏ کرم کردی الٰہی زندہ باشی

مسجدِ قرطبہ

میری ناقص رائے میں "مسجدِ قرطبہ" صرف اقبال ہی کی عظیم ترین نظم نہیں ہے بلکہ ہماری ساری اُردو شاعری میں، اس وقت، عظیم ترین شہ پارہ ہے۔ اِس نظم کو نمائش میں پیش کرنا میں بہت ضروری سمجھتا تھا چنانچہ اپنے کاغذوں میں اِس مسجد کے بارے میں وہ مواد تلاش کرنا شروع کیا جو ۱۹۶۲ء میں اس مسجد کی زیارت کے بعد ہسپانیہ سے اپنے ساتھ لایا تھا۔ خوش قسمتی سے ان کاغذات میں مجھے توریس بلباس کی تصنیف LA MEZQUITA DE CORDOBA دستیاب ہوگئی۔ مسجد قرطبہ کی تصویروں سے مزین یہ کتاب فوٹوگرافی کے ان نادر نمونوں پر مشتمل ہے جو تصویر کشی کے فن میں شاہکار کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ان کے نیگیٹو مجھے میرے دوست جناب پی۔ این۔ بقایا، ڈائریکٹر انفارمیشن، حکومت جموں و کشمیر نے بنوا دیے جن کی بدولت میرے بنائے ہوئے خاکے میں رنگ آمیزی کا کام مکمل ہوگیا۔ بقایا صاحب کا شکریہ ادا کیے بغیر میری یہ تحریر یقیناً نامکمل رہے گی۔

اقبال کی یہ تمام تصویریں اور اردو انگریزی تحریریں جو دُنیائے ادب میں جاودانی مقام رکھتی ہیں۔ دہلی میں میرے عزیز دوست جناب وی۔ این۔ ککڑ کی زیرِ نگرانی اُس صورت میں ظہور پذیر ہوئیں جس صورت میں آج ناظرین انھیں نمائش میں دیکھ رہے ہیں۔ اس سلسلے میں میرے محترم دوست جناب کے۔ کے۔ نائر کا مشورہ اور رہنمائی جو ملیالم اور انگریزی ادب میں کرشنا چیتنیہ کے نام سے مشہور ہیں، قدم قدم پر حاصل رہی۔ کے۔ کے۔ نائر اور وی۔ این۔ ککڑ کی اس توجہ بلکہ دل گرمی اور دلسوزی کے بغیر میرے یا ڈاکٹر محمد حسن کے خیال کا اِس طرح عملی جامہ پہننا ممکن نہ تھا۔ میں اِس توجہ کے لیے ان دونوں کا سپاس گزار ہوں۔

فنِ لطیف کوئی بھی ہو نا تمام ہے

ابھی یہ نمائش تکمیل کی منزلوں میں تھی کہ میری درخواست پر دہلی یونیورسٹی کے بعض اُردو اساتذہ جن میں ڈاکٹر ظہیر احمد صدیقی، ڈاکٹر قمر رئیس، ڈاکٹر عبد الحق اور ڈاکٹر فضل الحق کے نام خاص طور سے قابلِ ذکر ہیں میری اِس کوشش کو جسے میں کوششِ ناکام کے سوا اور کوئی نام نہیں دے سکتا ایک نظر دیکھنے کے لیے آئے۔ مجھے مسرت ہے کہ انھوں نے میری کاوش کو بہ نظرِ تحسین دیکھا اور مجھے اپنے قیمتی مشوروں سے نوازا۔ ان احباب کی یہ فرمائش کہ یہ نمائش چند روز کے لیے دہلی یونیورسٹی میں بھی منتقل کی جائے میرے لیے فخر و مسرت کا باعث ہے۔

ماہر غالبیات مالک رام، عابد علی خان، مدیر "سیاست" حیدرآباد، شہباز حسین، ڈائریکٹر ترقیِ اردو بورڈ، غلام رسول سنتوش، ڈاکٹر گیان چند، صدر شعبۂ اُردو جموں یونیورسٹی جموں، کے۔ کے۔ کھُلر، سید حامد جوائنٹ سیکرٹری وزارتِ داخلہ، سید مظفر حسن برنی، ایڈیشنل سیکرٹری، منسٹری آف پٹرولیم اینڈ کیمیکلز، قرۃ العین حیدر، بیگم حامدہ حبیب اللہ اور رسمان صاحب، سابق نمائندہ "ٹائمز آف انڈیا" کا بھی ممنون ہوں جنھوں نے ایڈیٹنگ روم میں اِس نمائش کو دیکھا۔ ان تمام کرم فرماؤں کے گراں قدر مشورے اِس نمائش کی قدر و قیمت میں اضافے کا باعث ہوئے۔

مذکورہ بالا تمام حضرات کی عنایات کا نتیجہ اقبال نمائش، مری نگر کی صورت میں اہلِ ملک کے سامنے ہے۔ میں خوش ہوں کہ ڈاکٹر محمد حسن کی خواہش اور میری محنت بار آور ہوئی۔

ڈاکٹر محمد حسن کے کشمیر یونیورسٹی سے طویل چھٹی پر چلے جانے کے بعد اُن کے جانشین ڈاکٹر شکیل الرحمان کا تعاون مجھے قدم قدم پر حاصل رہا۔ مری نگر میں اِس نمائش کو عملی صورت دینے کے لیے ڈاکٹر شکیل الرحمان نے اہم مشورے دیے۔ دراصل ڈاکٹر شکیل الرحمان کے گراں

بہا مشورے مجھے اُس وقت بھی حاصل رہے جب میں اس نمائش کی MASTER COPY مرتب کر رہا تھا۔ اور اب سری نگر میں ۲۰ اکتوبر کو اس نمائش کے انعقاد کے لیے انھوں نے ہر طرح کی ذمہ داری سنبھال کر میرے کام کو بہت آسان بنا دیا ہے۔

یہ نمائش غالباً ملک کے اور حصّوں میں بھی جائے گی۔ مثلاً پروفیسر آل احمد سرور نے علی گڑھ میں، سردار جعفری نے بمبئی میں، بیگم حامدہ حبیب اللہ نے لکھنؤ میں، ڈاکٹر عابد رضا بیدار نے پٹنے میں اور جناب عابد علی خان نے اسے حیدرآباد میں منعقد کرنے کا خیال ظاہر کیا ہے۔ اس سلسلے میں میری گزارش یہ ہے کہ ملک کے طول و عرض میں جو حضرات اس نمائش کو دیکھیں وہ از راہِ کرم اپنے تاثرات سے مجھے مطلع فرمائیں تاکہ صرف یہی نہیں کہ اپنی خامیوں سے مجھے آگاہی ہو سکے بلکہ ان تاثرات اور مشوروں کی روشنی میں اس نمائش میں مزید اضافے کیے جا سکیں۔ سردست تو علامہ اقبال کے الفاظ میں مجھے اپنی ناچیز کوشش کے بارے میں یہی کہنا ہے

"تمام مضموں مرے پُرانے، کلام میرا خطا سراپا
ہنر کوئی دیکھتا ہے مجھ میں تو عیب ہے میرے عیب جو کا"

نمائش کے مختلف گوشے

یہ تحریر ختم کرنے سے پہلے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس نمائش کے مختلف گوشوں کا ایک مختصر سا ذکر کر دیا جائے۔ ان گوشوں کی ترتیب یہ ہے:

(۱) اقبال کی کہانی تصویروں کی زبانی
(۲) اقبال اور ان کا خاندان
(۳) اقبال کے اساتذہ
(۴) تو ابھی رہگزر میں ہے قیدِ مقام سے گزر
(۵) اقبال اور مسجد قرطبہ
(۶) غرناطہ بھی دیکھا مری آنکھوں نے ولیکن ؛ ہے دل کی تسلی نہ نظر میں نہ خبر میں
(۷) دو دوست — علامہ اقبال اور مہاراجہ سرکشن پرشاد
(۸) اقبال کی مرتب کردہ درسی کتب
(۹) تصانیف اقبال کے اولین ایڈیشن
(۱۰) اسکول، کالج اور یونیورسٹی میں اعزازات
(۱۱) یادگار مشاعرہ
(۱۲) پسندیدہ شاعر اور پسندیدہ شعر
(۱۳) اسلامی طرز کے پسندیدہ نام
(۱۴) اقبال کی اردو تحریریں (بہ خطِ اقبال)
(۱۵) اقبال کے اردو مکاتیب (بخطِ اقبال)

(۱۹) "سلام و پیام" پر اقبال کا مکتوب (بہ خطِ اقبال)

(۱۷) اقبال کے انگریزی مکاتیب (بہ خطِ اقبال)

(۱۸) اقبال کے خطوط بیگم عطیہ فیضی کے نام (بہ خطِ اقبال)

(۱۹) اقبال کی انگریزی تحریریں (بہ خطِ اقبال)

(۲۰) کلامِ اقبال بہ خطِ اقبال

(۲۱) کلامِ اقبال اولین صورت میں

(۲۲) تراجم اقبال

(۲۳) اقبال اور پریم چند

(۲۴) مفسرینِ کلامِ اقبال

(۲۵) لغت اور زبان کی باریکی پر اقبال کی نظر

(۲۶) اقبال مصوروں کی نظر میں

(۲۷) کلامِ اقبال مصوروں کی نظر میں

(۲۸) اقبال کے اشعار — خطاطی کے نمونے

(۲۹) چو رخت خویش بربستم ازیں خاک

(اقبال کے انتقال پر ملا بندر ناتھ ٹیگور، سروجنی نائڈو، جواہر لعل نہرو، سبھاش چندر بوس، ابوالکلام آزاد، سر شہاب الدین اور دوسرے زعماء کا اظہارِ غم)

(۳۰) متفرقات

ایک زیرِ تجویز گوشے کا عنوان جو میں ابھی تک اس نمائش میں شامل نہیں کر سکا "موضوعاتِ اقبال" ہے۔ اسے شامل نہ کرنے کا سبب یہ ہے کہ یہ عنوان کئی ضمنی عنوانوں میں تقسیم ہو سکتا ہے اور اگر ہر عنوان پر تصاویر جمع کی جائیں تو صرف اسی گوشے کے لیے تصاویر کی تعداد قریب قریب اتنی ہی ہو جاتی جتنی تعداد ساری نمائش کی تصویروں کی ہے۔ موجودہ صورت میں نمائش قریباً پانچ سو تصاویر پر مشتمل ہے۔ "موضوعاتِ اقبال" کا گوشہ شامل کرنے سے یہ تعداد ایک ہزار تک پہنچ جاتی اور اتنی بڑی نمائش کو سنبھالنا عملی اعتبار سے ایک دشوار کام ہوتا ہے۔

نئی دہلی۔ ۷ ستمبر ۱۹۷۳ء

اعتذار

قومی زبان ماہ فروری ۱۹۷۴ء کے شمارے میں ایک مضمون "اقبال کا حرفِ شیریں" پر لکھنے والے کا نام جناب بشیر احمد ڈار کے بجائے غلطی سے "ڈاکٹر ریاض" چھپ گیا ہے قارئین کرام تصحیح فرمالیں، مقالہ نگار حضرات سے درخواست ہے کہ وہ مسودے پر اپنا نام ضرور تحریر فرمائیں۔ (ادارہ)

اقبال اور سر اکبر حیدری

محمد حبیب اللہ رشدی

اقبال نے گورستان شاہی والی نظم ۱۹۱۰ء میں حیدر آباد دکن میں کہی تھی جب کہ وہ حیدر آباد میں سر اکبر حیدری کے مہمان تھے "بانگ درا" میں اس نظم پر نوٹ نہیں ہے۔ اس لئے شبہ ہو سکتا ہے کہ ہندوستان میں واقعی "گورستان شاہی" موجود بھی ہے یا نہیں یا شاعر نے گورغریباں کے جواب میں "گورستان شاہی" کی ایک نئی ترکیب تو نہیں بنائی۔ میرا خیال ہے کہ یہ نظم پہلی مرتبہ "مخزن" لاہور میں اس توضیحی نوٹ کے ساتھ شائع ہوئی تھی کہ شاہان گول کنڈہ کے مقبروں سے متاثر ہو کر اقبال نے یہ نظم کہی ہے۔ دکن میں مغلیہ سلطنت کا اقتدار قائم ہونے سے پہلے بہمنیہ سلطنت کے ٹوٹ جانے کے بعد پانچ ریاستیں بنی تھیں ان میں سے صرف "گول کنڈہ" اور بیجاپور کی دو آخری ریاستیں عہد عالمگیری تک باقی رہ گئی تھیں۔ بیجاپور پر عادل شاہی خاندان کی حکومت تھی اور گول کنڈہ پر قطب شاہی خاندان حکمراں تھا۔ اس زمانہ میں گول کنڈہ ہی قطب شاہی بادشاہوں کا دارالحکومت تھا۔ ہیروں کی سب سے بڑی منڈی ہونے کے لحاظ سے دنیا بھر میں مشہور تھا۔ شہر حیدر آباد کی اس وقت کوئی اہمیت نہیں تھی۔ وہ گول کنڈہ سے سات آٹھ میل کے فاصلے پر ایک چھوٹا سا قصبہ تھا جو ایک قطب شاہی شہزادے کی محبوبہ بھاگ متی کے نام پر "بھاگیہ نگر" یا "بھاگ نگر" کہلاتا تھا۔ پورا شہر گول کنڈہ ایک بہت بڑا قلعہ ہے عنبری پتھر (گرانائٹ) کی ایک مضبوط سنگین فصیل کے اندر سات آٹھ مربع میل کا رقبہ ہے جس میں شہر کی آبادی اور شاہی محلات کے علاوہ تالاب اور کھیت بھی ہیں۔ تمام قطب شاہی بادشاہوں کے مقبرے گول کنڈے کی پچھلی فصیل کے باہر ایک احاطے میں ہیں۔ مقبروں کے درمیان کھلی جگہ میں چمن بندی ہے جس کی نگہداشت کے لیے سرکاری عملہ مقرر تھا۔ مقبروں کے تقریباً وسط میں حمام کی ایک پختہ عمارت اور اس کے ایک طرف ایک حوض مگر یہ زندوں کا حمام نہیں مردہ قطب شاہی بادشاہوں کا حمام ہے جب کوئی بادشاہ مرتا تھا تو اس کی میت کو اس حمام میں غسل دیا جاتا تھا۔

ہر بادشاہ کے مقبرے کے ساتھ ایک مسجد بھی ہے۔ یہ تاریخی مقبرے بڑے پرفضا مقام پر ہیں۔ حیدر آباد کے بہت سے لوگ مزوں کی سیر کے لیے آتے ہیں اور پورا دن گزار کر جاتے ہیں۔ شہر حیدر آباد کے قابل دید مقامات میں یہ شاہی مقبرے بھی شامل ہیں۔ اکثر بیرونی سیاح بھی یہاں آتے رہتے ہیں۔

اگرچہ حضرت اقبال کا یہ قیام حیدر آباد بہت مختصر تھا مگر ان کے شاعرانہ مزاج کا لحاظ کر کے سر اکبر حیدری یا لیڈی حیدری نے انہیں ان مقبروں کی سیر کرنے کی ترغیب دی ہوگی اور صبح سویرے ہی انہیں یہاں پہنچانے کا انتظام کر دیا ہوگا۔ حضرت اقبال یہاں کے منظر سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکے چنانچہ نظم کا آغاز اس طرح کرتے ہیں ؎

کچھ مکدر سا جبیں ماہ کا آئینہ ہے — آسماں بادل کا پہنے خرقہ دیرینہ ہے
چاندنی پھیکی ہے اس نظارۂ خاموش میں — صبح صادق سو رہی ہے رات کے آغوش میں

شہنشاہ اورنگ زیب کا گول کنڈے اور بیجاپور کی ریاستوں کا خاتمہ کر دینا ایک تاریخی بحث کا موضوع ہے۔ گول کنڈہ کا قلعہ اتنا مضبوط تھا کہ شہنشاہ کو کئی مہینے تک اس کا محاصرہ کرنا پڑا کہا جاتا ہے کہ گول کنڈے کے ایک فوجی افسر کی غداری سے مغلیہ فوجیں قلعے میں داخل ہو سکیں اور

آخری قطب شاہی حکمران ابوالحسن تاناشاہ کو گرفتار کر لیا۔

مغلیہ فوج کے محاصرے کا ایک واقعہ یہ ہے کہ حیدرآباد کے آصف جاہی (نظام) خاندان کے بانی میر قمرالدین نظام الملک آصف جاہ کے والد غازی الدین فیروز جنگ اور دادا خواجہ عابد (قلیچ خان) دونوں محاصرہ کرنے والی مغلیہ فوج کے منصب دار (افسر) تھے اور اس محاصرے میں اپنی اپنی فوجوں کے ساتھ مختلف سمتوں میں متعین تھے۔ باپ کے منصب سے بیٹے کا منصب بڑھا ہوا تھا۔ خواجہ عابد (قلیچ خان) کا پڑاؤ موجودہ مصنوعی جھیل حمایت ساگر یعنی ندی کے کنارے گول کنڈے سے چند فرلانگ کے فاصلے پر تھا۔ قلعے والے قلعے کی بلندی سے اپنی بڑی بڑی توپوں سے برابر گولہ باری کرتے رہتے تھے۔ ایک گولہ خواجہ عابد (قلیچ خاں) کی چھاؤنی کے قریب آکر پھٹا۔ اس کا ایک ٹکڑا خواجہ عابد (قلیچ خاں) کے شانے پر لگا اور ہڈی توڑ دی۔ شہنشاہ اورنگ زیب کا پڑاؤ دوسری سمت میں تھا۔ جب اطلاع ہوئی تو شہنشاہ نے دوسرے دن سویرے ہی ایک منصب دار (فوجی افسر) کو مزاج پرسی کے لیے بھیجا۔ اس نے خواجہ عابد (قلیچ خاں) کا جو حال شہنشاہ سے بیان کیا اس کو موّرخوں نے تاریخ میں درج کر لیا ہے۔ شہنشاہ کا بھیجا ہوا منصب دار جب خواجہ عابد کے ہاں حاضر ہوا تو دیکھا کہ خواجہ عابد اپنے تندرست ہاتھ میں قہوے کی پیالی لیے قہوہ پی رہے ہیں۔ دوسرے ہاتھ کو جرّاح نے نشتر سے چیر دیا ہے۔ اور ہڈیوں کے باریک ٹکڑوں کو چن چن کر نکال رہا ہے۔ مگر اس زخم سے خواجہ (قلیچ خاں) جاں بر نہ ہو سکے جس جگہ وفات پائی اسی جگہ مدفون ہوئے شاہد حیدرآباد کی فتح میں دادا نے اپنی جان دے کر پوتے کے لیے سلطنت کی بنیاد رکھ دی۔ ان کے مدفن پر بغیر گنبد کی بڑی بارہ دری بنادی گئی تھی اس مقبرے کے اطراف چند کچے مکانوں کا ایک چھوٹا سا گاؤں آباد ہو گیا جس کا نام قلیچ خاں کی درگاہ پڑ گیا۔ پچاس سال کے بعد قلیچ خاں کے پوتے نظام الملک آصف جاہ نے اس ملک پر اپنی حکومت قائم کر لی جو سات پشتوں تک رہی لیکن ان حکمرانوں میں سے کسی ایک نے بھی اس مقبرے پر کوئی شاندار گنبد بنانے یا اس کی دیکھ بھال کے لیے کوئی معقول عملہ مقرر کرنے یا گاؤں کی حالت بہتر بنانے کی طرف توجہ نہیں کی۔ حضور نظام کے ذاتی خزانے سے تقریباً دو سو صوفیا، مذہب اکابر ریاست اور اقربائے نظام کی برسی یا عرس منایا جاتا تھا جن میں تقریباً پچاس اکابر کے اخراجات عرس سو روپے سے زاید ہیں اور چند کے لیے تقریباً ہزار روپیہ منظور ہیں لیکن بیچارے قلیچ خاں کے عرس کے لیے صرف (۳۵) روپے ہی منظور کیے گئے تھے۔ ۲۰ ربیع الاول کو ان کا عرس منایا جاتا تھا۔ حضرت اقبال اورنگ عالمگیر کے محاصرۂ گول کنڈہ کی طرف اس طرح اشارہ کرتے ہیں۔ ؎

آہ جولاں گاہ عالمگیر، یعنی وہ حصار　　دوش پر اپنے اٹھائے سینکڑوں صدیوں کا بار
زندگی سے تھا کبھی معمور، اب سنسان ہے　　یہ خموشی اس کے ہنگاموں کا گورستان ہے
اپنے سکّانِ کہن کی خاک کا دلدادہ ہے　　کوہ کے سر پر مثالِ پاسباں استادہ ہے

شاہانِ قدیم کے مقبروں کو دیکھ کر اقبالؔ اپنی قوم کے زوال کے آنسو بہائے بغیر نہ رہ سکے۔

خوابگہ شاہوں کی ہے یہ منزلِ حسرت فزا　　دیدۂ عبرت! خراجِ اشکِ گلگوں کر ادا
ہے تو گورستاں، مگر یہ خاک گردوں پایہ ہے　　آہ اک برگشتہ قسمت قوم کا سرمایہ ہے

پھر انسان کی زندگی کا حال اس طرح بیان کرتے ہیں۔ ؎

زندگی انساں کی ہے مانندِ مرغِ خوش نوا　　شاخ پر بیٹھا کوئی دم، چہچہایا، اڑ گیا
آہ کیا آئے ریاضِ دہر میں ہم، کیا گئے　　زندگی کی شاخ سے پھوٹے، کھلے، مرجھا گئے

پھر اقوام کی زندگی کے متعلق فرماتے ہیں ؎

رنگ ہائے رفتہ کی تصویر ہے ان کی بہار — زندگی اقوام کی بھی ہے یونہی بے اعتبار
اس زیاں خانے میں کوئی ملّتِ گردوں وقار — رہ نہیں سکتی ابد تک بار دوشِ روزگار

موجودہ تاریخ تمدن میں قدیم ترین ترقی یافتہ قومیں مصر و بابل کی تھیں۔ یہ دونوں قومیں سینکڑوں بلکہ ہزاروں برس تک ہم عصر رہیں۔ بعد میں ایران نے ترقی کی۔ ایران کے اولین بادشاہ کرش اعظم (کسریٰ اول سائرس) نے بابل اور نینوا کو فتح کر کے اس قدیم مرکز تہذیب کا خاتمہ کر دیا۔ اس کے بیٹے کمبوجیا (کمبی سس) نے عراق سے آگے بڑھ کر فلسطین اور مصر کو فتح کیا۔ کمبوجیا کے چچیرے بھائی داریوش اعظم (دارائے اول) نے مشرق میں خراسان اور ہندوستان میں پنجاب تک کا علاقہ اور مغرب میں یونان کے علاقے کو فتح کر کے یورپ کے مشرقی ممالک پر حملہ کیا۔ اس طرح ایرانی سلطنت دنیا کی سب سے پہلی سب سے بڑی سلطنت بن گئی۔ کچھ مدت کے بعد اس سلطنت کو زوال آیا۔ یونانی قوم ابھری اسکندر اعظم نے ایران اور ایران کے سارے مقبوضات فتح کیے۔ اس کے بعد رومن قوم ابھری اس نے یونان پر فتح پائی اور اس کے بہت سے مقبوضات پر قبضہ کر لیا۔ کئی صدیوں کے بعد اسلام کا ظہور ہوا اور مسلمانوں نے ایک طرف ایران کو فتح کیا اور دوسری طرف شام، فلسطین اور مصر میں رومن قوم کو شکست دے کر ان ملکوں پر قبضہ کر لیا۔ قوموں کے عروج و زوال کا یہ حال جدید محققین تاریخ کی تحقیقات کا نتیجہ ہے۔ حضرت اقبال نے اسی تسلسل کے ساتھ قوموں کے عروج و زوال کو تین شعروں میں اس طرح پیش کیا ہے۔

دفترِ ہستی میں ان کی داستاں تک بھی نہیں — مصر و بابل مِٹ گئے، باقی نشاں تک بھی نہیں
آ دبایا مہرِ ایراں کو اجل کی شام نے — عظمتِ یونان و روما لوٹ لی ایام نے
آہ مسلم بھی زمانے سے یونہی رخصت ہوا — آسماں سے ابرِ آذاری اٹھا، برسا، گیا

مقبروں کی سیر میں کچھ وقت گزر گیا۔ دن نکل آیا۔ آس پاس کی پہاڑیوں پر چرواہے بکریاں چرانے آنے لگے۔ ذرا اس کیفیت کو ملاحظہ فرمائیے۔

باغ میں خاموش جلسے گلستاں زادوں کے ہیں — وادیٔ کہسار میں نعرے شباں زادوں کے ہیں
زندگی سے یہ پرانا خاک داں معمور ہے — موت میں بھی زندگانی کی تڑپ مستور ہے
پتیاں پھولوں کی گرتی ہیں خزاں میں اس طرح — دستِ طفلِ خفتہ سے رنگیں کھلونے جس طرح
اس نشاط آباد میں گو عیش بے اندازہ ہے — ایک غم، یعنی غمِ ملت ہمیشہ تازہ ہے

مقبروں سے واپسی میں شاعر کے جذبات یہ تھے۔

دل ہمارے یادِ عہدِ رفتہ سے خالی نہیں — اپنے شاہوں کو یہ امت بھولنے والی نہیں
دہر کو دیتے ہیں موتی دیدۂ گریاں کے ہم — آخری بادل ہیں اک گزرے ہوئے طوفاں کے ہم
ہیں ابھی صدہا گہر اس ابر کی آغوش میں — برق ابھی باقی ہے اس کے سینۂ خاموش میں
ہو چکا گو قوم کی شانِ جلالی کا ظہور — ہے مگر باقی ابھی شانِ جمالی کا ظہور

قومی زوال پر اقبال کا دل کڑھتا ہے۔ مگر وہ قنوطیت پسند نہیں۔ مستقبل کے بارے میں ان کا دل امیدوں سے بھرا ہوا ہے۔ انہیں پیغام اسلام پر اتنا اعتماد ہے کہ وہ اپنی قوم کو ابھرنے والی قوم سمجھتے ہیں لیکن [illegible] اس کی ترقی ملکوں کی فتوحات [illegible]

میں نہیں ہوگی بلکہ علم و فن کے میدان میں ہوگی یعنی ثقافتی ترقی ہوگی۔ پہلی ترقی کو وہ "شانِ جلالی" قرار دیتے ہیں اور دوسری صورت کو "شانِ جمالی"۔ اور یہ اعتماد رکھتے ہیں کہ اس مرتبہ اسلام کے پیرو اپنی "شانِ جمالی" دکھائیں گے۔ اگرچہ بظاہر "شانِ جمالی" کے ظہور کی کوئی صورت اس وقت نظر نہیں آرہی ہے مگر یہ کچھ بعید بھی نہیں ہے۔

سو ڈیڑھ سو سال پہلے جاپان کا کیا حال تھا اور اب کیا ہے۔ مغرب کی موجودہ ترقی نشاۃ ثانیہ کا آغاز کیا تھا۔ یورپ کی نشاۃ ثانیہ مسلمانوں ہی کی نشاۃ ثانیہ کا نتیجہ ہے۔ یہ بات اب مغرب میں بھی تسلیم کی جارہی ہے پھر ہمیں مایوس ہونے کی کوئی وجہ نہیں ہے۔

اقبال ۱۹۱۰ء میں حیدر آباد کیوں گئے تھے اور سر اکبر حیدری کے ہاں قیام کرنے کی کیا وجہ ہے؟ اس کا باعث بمبئی کی مشہور خاتون عطیہ بیگم تھیں۔ جب تک عطیہ بیگم نے اقبال پر اپنی کتاب نہیں لکھی اور ان کے خطوط شائع نہیں کیے کسی کو عطیہ بیگم اور اقبال کی دوستی کا علم نہیں تھا۔ اردو کے ادبی حلقوں کو عطیہ بیگم اور مولانا شبلی کی دوستی کا علم تھا لیکن جب تک عطیہ بیگم نے اقبال کے متعلق اقبال کے خطوط شائع نہیں کیے کسی کو اس کا گمان بھی نہیں تھا کہ عطیہ بیگم اور حضرت اقبال ایک دوسرے کو جانتے پہچانتے ہیں چنانچہ وہ خود اس کتاب[1] کے دیباچہ میں لکھتی ہیں۔

"یہ عجیب سی بات خیال کی جائے گی کہ میں نے اقبال کے خطوط کو اور یورپ میں ان کی تعلیمی زندگی کے بارے میں اپنے تاثرات کو کتابی صورت میں شائع کرنے کا ارادہ کیا، حالانکہ اتنے برس ایسی کتاب کا مواد میرے پاس اس طرح پڑا رہا ہے کہ کسی کو کانوں کان خبر نہیں ہوئی۔"

---

[1] کتاب انگریزی "اقبال" از عطیہ فیضی مترجم ضیاء الدین احمد برنی

دنیائے اردو کے لیے سالِ رواں کا آغاز بے حد نامبارک ہوا کہ اسے اشاعتِ اردو سے سچی لگن رکھنے والے ایک مخلص کی دائمی جدائی کا داغ اٹھانا پڑا۔ ان کا نام محمد علی خاں تھا جو ۶۶ سال کی عمر میں ۱۲ جنوری ۱۹۷۴ء کو بمقام راولپنڈی راہیٔ ملک عدم ہوئے۔

مرحوم ۱۹۰۸ء میں سنبھل مراد آباد کے ایک باوقار، شریف اور روشن خیال گھرانے میں پیدا ہوئے تھے اور تعلیم سے فارغ التحصیل ہونے کے بعد محکمہ پولیس میں ملازم ہوئے اپنی ذہانت و حسن کارگزاری کے باعث اعلیٰ منصب پر فائز ہوگئے۔ ہندوستان کی تقسیم کے بعد مجبور ہوکر ترکِ وطن کیا۔ مرحوم کو اردو زبان کی ترقی و اشاعت سے والہانہ لگاؤ تھا۔ اردو کے ہونہار طلبہ کی مالی اعانت کو اپنا مذہبی فریضہ تصور کرتے تھے۔ قومی اداروں کی بالعموم اور اردو اسکولوں اور انجمن ترقی اردو کی شاخوں کی حسبِ ضرورت مدد کرتے تھے۔

مرحوم محمد علی خاں کو اردو کے ساتھ بابائے اردو سے بھی بے پناہ عقیدت تھی۔ دہلی کے روح فرسا اور پُرآشوب دور میں بھی جب کہ گھر سے قدم باہر نکالنا موت کو دعوت دینا تھا روزانہ اُن سے ملنے جاتے تھے۔ انجمن کی جملہ مطبوعات انھیں اپنی جان سے زیادہ عزیز تھیں اور ان کو ہمیشہ سینے سے لگائے رکھتے تھے۔

مرحوم فنی شاعر نہ تھے لیکن موزونیٔ طبع کے باعث کبھی کبھی مزاحیہ اشعار نظم کر لیتے تھے۔ مشرقی پاکستان کے قیام کے زمانے میں اُدھر کے سارے علاقے میں اپنے مخصوص رنگ کلام کی وجہ سے عام شہرت حاصل کر چکے تھے ظاہر ہے کہ ایسے بے لوث ہمدرد انجمن اور مخلص اردو نواز کی جدائی۔ مجبانِ اردو کے لیے ایک عظیم سانحہ کیونکر نہ ہوگی۔ خدا بخشے بہت سی خوبیاں تھیں مرنے والے میں۔

اقبال
مسلمانوں کی وحدت کا داعی

ڈاکٹر محمد ریاض

دین اسلام اور دین حیات اور زندگی بسر کرنے کا وہ بہترین دستور العمل ہے جو خداوند تعالےٰ نے اتمام نعمت کے طور پر نبی آخر الزمانؐ کے وسیلے سے اور قرآن مجید کی صورت میں اہل عالم کو عنایت فرمایا ہے۔ اس دین کے ماننے والے دنیا کے کسی خطّے کے رہنے والے ہوں، کوئی زبان بولتے ہوں، کسی رنگ کے ہوں اور کسی بھی حسب و نسب کے حامل ہوں سب آپس میں بھائی بھائی ہیں، کل مومن اخوۃ کی بڑی واضح تعلیم ہے مگر افسوس کہ فرقہ بندیوں اور کئی دوسری حد بندیوں مثلاً وطنیت کے سیاسی تصور نے اس اخوت اور مواخات کا شیرازہ منتشر کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی ہے۔ الا ماشاء اللہ عام اسلام کے مسلمانوں کو ایک دوسرے سے جدا اور دور تر کرنے میں وطنیت یا وطن پرستی کے مغربی نظریے کا بڑا گھناؤنا رول ہے۔ اس تصور کی ایک صورت ملکوں میں صوبائی رجحانات اور تعصبات ہیں اور ظاہر ہے یہ نظریہ حب وطن کے مقدس جذبے سے ایک الگ ہی چیز ہے۔

حب وطن کا لازمہ یہ ہے کہ اپنے ملک کی ایک ایک انچ زمین سے محبت کی جائے اور اس کے تحفظ اور بقا کی خاطر تن من دھن کی بازی لگا دی جائے۔ حب وطن کا یہ بھی تقاضہ ہے کہ اپنے ملک کی ہر ادنیٰ و اعلیٰ چیز کو قدر کی نگاہ سے دیکھا جائے اور اپنے خارمغیلان کو دوسروں کے سنبل و ریحان پر ترجیح دی جائے۔ یہ ایک فطری مقدس جذبہ ہے اور اس جذبے کا ہونا وطن دوستی اور انسان دوستی کا تقاضا ہے۔ جن قوموں کے افراد کے دلوں میں وطن کی محبت نہ ہو ان کا مستقبل متزلزل اور غیر یقینی ہوتا ہے۔

مگر وطنیت اور ملیت کا سیاسی تصور کچھ اور ہی ہے وہ ایک دنیادارانہ اور لادین سیاسی تصور ہے۔ جس کے نتیجے میں اخوت اور مواخات کی جڑیں کٹ جاتی ہیں۔ جہاں دین و مذہب سے فرض نہیں۔ اپنے حسب و نسب پر مفاخرت اور فخر فروشی ہے اپنے ہی محدود مفادات و اغراض پیش نظر ہیں اور بس۔ دوسرے اہل دین اور اخوان اگر اس خاص جغرافیائی حدود سے باہر ہوں تو ان کو کوئی نہیں پوچھتا ہے۔ اسی تصور کی گھٹیا قسم فرقہ بندی اور وطن کے اندر کے علاقائی تعصبات ہیں جس کی جتنی مذمت کی جائے کم ہے۔

"وطنیت محدود" کا یہ سیاسی تصور فلارنس (اٹلی) کے مشہور سیاسی مفکر میکیاولی نے اپنی تالیف "کتاب الملوک" میں بڑی شرح و بسط کے ساتھ پیش کیا ہے اور اس کے زہریلے اثرات شرق و غرب میں ہر جگہ نظر آتے ہیں۔ علامہ اقبال اس تصور کے خلاف یوں احتجاج کرتے ہیں:

دہریت چوں جامۂ مذہب درید　　مرسلی از حضرت شیطان رسید
آن فلارنسائی باطل پرست　　سرمۂ او دیدۂ مردم شکست

نسخۂ ای مہر شہنشاہان نوشت   دو گلِ ما داں پیکار کشت [1]

انیسویں اور بیسویں صدی عیسوی میں چند مسلمان زعماء نے عالم اسلام کو متحد کرنے نزدیک لانے اور وطنیت کے اس تصور کے نمایاں بڑی نمایاں کوششیں کی ہیں۔ ان زعماء میں سید جمال الدین اسد آبادی افغانی (۱۸۳۸ - ۱۸۹۷ء) اور سعید حلیم پاشا ترک (۱۹۲۲ء) سرفہرست نظر آتے ہیں۔ علامہ اقبال نے بھی ان عظیم راہبروں کی خدمات کو سراہا اور ان کی عالمی خدمات کا اعتراف کیا ہے مولانائے روم کی زبانی فرماتے ہیں ؎

گفت مشرق زین دو کس بہتر نزاد   ناخن شان عقدہائے ما گشاد
سید السادات مولانا جمال   زندہ از گفتار او سنگ و سفال
ترک سالار آن حلیم دردمند   فکر او مثل مقام او بلند [2]

سید جمال الدین کی عالمگیر اسلامی خدمات ہمارے ہاں اکثر لکھی جاتی رہی ہیں۔ اس بطل حریت نے برصغیر پاکستان و ہند، افغانستان ایران، ترکی، مصر، فرانس، روس، انگلستان اور امریکہ میں پیغام حق بلند کیا۔ استبداد و استعمار کے محلات کی چولیں ہلا کر رکھ دیں۔ اور غفلت مآب اور تغافل شعار مسلمانوں میں ایک عام بیداری پیدا کی ہے، اسی بطل جلیل کی مساعی سے قرآن مجید کا روسی زبان میں ترجمہ ہوا اور چھپا۔

سعید حلیم پاشا ایک بیدار مغز ترک جو سید جمال الدین کے افکار کو قدر کی نگاہ سے دیکھتے اور اسی سید کی مانند وحدت و اتحاد عالم اسلامی کے قائل اور اسلام کی ہمہ گیریت اور دین و سیاست کے انضمام کے معتقد تھے۔ اپنی یادداشتوں میں لکھتے ہیں "جس طرح انگلستانی ریاضیات جرمن نجوم یا فرانسیسی کیمسٹری نہیں کہی جاتی۔ اسی طرح اسلام کو ترکی، عربی، ایرانی یا ہندوستانی نام دینا اور مسلمانوں کو ایک خاص حصّے سے منسوب کرنا زیادتی ہے جس طرح سائنسوں اور علوم و فنون کے کلیات عالمی اور سب کے لئے ہیں اسی طرح اسلامی حقائق عالمگیر اور اٹل ہیں ان کو وطنی اور ملی حدود میں بند نہیں کیا جا سکتا، علامہ اقبال نے اس اقتباس کو کامل صورت میں اپنی "تشکیل الٰہیات جدید" میں نقل کیا ہے۔

علامہ اقبال مرحوم و مغفور نے ان ہی خطوط پر عالم اسلام کے اتحاد و یگانگت کی کوشش کی اور اپنی ساری تصانیف میں اس فکر کو بانداز ہائے مختلف بیان کیا ہے۔ آج کل شاعر مشرق کی تصانیف کو اس خاص نقطۂ نگاہ سے پڑھنے کی بڑی ضرورت ہے، یہ مطالعہ بتاتا ہے کہ اس اسلامی مفکر کو عالم اسلام کے مسلمانوں سے کس قدر ہمدردی تھی۔ مذہبی دھڑے بازیوں، نفاق اور تعصب کو وہ منجملہ اسباب سمجھتے تھے جن سے مسلمانوں کو زوال ہو تا رہا ہے۔ وطنیت کے تصور کے خلاف اور اسلامی اخوت و مراخات کی حمایت میں ان کے اشعار کی ایک معتد بہ تعداد ہے جسے یہاں نقل نہیں کیا جا سکتا، چند اشعار دیکھیں ؎

جوہر ما با مقامی بستہ نیست   بادۂ تندش بجامی بستہ نیست
ہندی و چینی سفال جام ماست   رومی و شامی گل اندام ماست
قلب ما از ہند و روم و شام نیست   مرز و بوم او بجز اسلام نیست
اصل ملت در وطن دیدن کہ چہ؟   باد و آب و گل پرستیدن کہ چہ؟
بر نسب نازاں شدن نادانی است   حکم او اندر تن و تن فانی است

ما ز نعمتہائے او اخوان شدیم　　یک زباں و یک دل و یک جا شدیم [3]

ربط و ضبط ملت بیضا ہے مشرق کی نجات　　ایشیا والے ہیں اس نکتے سے اب تک بے خبر
پھر سیاست چھوڑ کر داخل حصار دیں میں ہو　　ملک و دولت ہے فقط حفظِ حرم کا اک ثمر
ایک ہوں مسلم حرم کی پاسبانی کے لئے　　نیل کے ساحل سے لے کر تا بخاک کاشغر
بتانِ رنگ و خوں کو توڑ کر ملت میں گم ہو جا　　نہ تورانی رہے باقی، نہ ایرانی، نہ افغانی
ہوس نے کر دیا ہے ٹکڑے ٹکڑے نوعِ انساں کو　　اخوت کا بیاں ہو جا، محبت کی زباں ہو جا
یہ ہندی وہ خراسانی، یہ افغانی وہ تورانی　　تو اے شرمندۂ ساحل! اچھل کر بے کراں ہو جا
غبار آلودۂ رنگ و نسب ہیں بال و پر تیرے　　تو اے مرغِ حرم اڑنے سے پہلے پرفشاں ہو جا [4]

"پیام مشرق" کے دیباچے میں لکھتے ہیں "اس وقت دنیا میں اور بالخصوص ممالک مشرق میں ہر ایسی کوشش جس کا مقصد افراد و اقوام کی نگاہ کو جغرافیائی حدود سے بالاتر کر کے ان میں ایک صحیح اور قوی انسانی سیرت کی تجدید یا تولید ہو قابل احترام ہے" (صفحہ م) اور اس ضمن میں اس کتاب کے چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

تو اے کودک منش خود را ادب کن　　مسلمان زادۂ؟ ترک نسب کن
برنگ احمر و خون و رگ و پوست　　عرب نازد اگر، ترک عرب کن
نہ افغانیم، و نے ترک و تتاریم　　چمن زادیم و از یک شاخساریم
تمیز رنگ و بو بر ما حرام است　　کہ ما پروردۂ یک نو بہاریم　(صفحہ ۵۲)

اسی کتاب (صفحہ ۱۵۰) میں علامہ نے طارق بن زیاد فاتح اندلس کی کشتیوں کو جلا دینے والے واقعہ کو نظم کیا ہے۔ اور نتیجہ یہ نکالا کہ

ہر ملک ملک ماست، کہ ملک خدائے ماست

فرماتے ہیں کہ "توحید و رسالت" کے عقائد کا تقاضا یہ ہے کہ سارے عالم اسلام کے مسلمان ایک جسم واحد کی مانند ہوں۔ اور ایک دوسرے کے رنج و غم، شادی و خوش حالی میں برابر کے شریک ہوں۔ ہمارا آئین قرآن مجید ہے، رسالت پیغمبر آخر الزماں پر ختم ہو گئی ہے۔ بیت الحرام سب کا مشترک قبلہ ہے۔ مساوات، حریت اور اشتراک عمل اسلام کے اساسی اصول ہیں تو پھر تعصب اور پراگندگی کی کیا علت باقی رہ جاتی ہے۔ اس ضمن میں چند ابیات ملاحظہ ہوں ؎

چیست ملت اے کہ گوئی لا الٰہ　　با ہزاراں چشم بودن یک نگہ
اہل حق را حجت و دعویٰ یکی است　　خیمہ ہائے ما جدا، دلہا یکی است

---

[3] اسرار و رموز ص ۱۰۷، ۱۲۹
[4] بانگ درا

مردہ ای؟ از یک نگاہی زندہ شو — بگذر از بے مرکزی پائندہ شو
وحدت افکار و کردار آفرین — تا شوی اندر جہاں صاحب نگین
پس خدا برما شریعت ختم کرد — بر رسول ما رسالت ختم کرد
تو ہمی دانی کہ آئین تو چیست؟ — زیر گردوں سرِّ تمکین تو چیست؟
آں کتاب زندہ قرآن حکیم — حکمت او لایزال است و قدیم
قوم را ربط و نظام از مرکزی — روزگارش را دوام از مرکزی
راز دار و راز ما بیت الحرام — سوزِ ما، ہم ساز ما بیت الحرام
در جہاں جان امم جمعیت است — در نگر سرِّ حرم جمعیت است

(جاوید نامہ، اسرار و رموز)

فرماتے ہیں کہ جناب رسالت مآب کی ہجرت کا مقدس واقعہ اتحاد عالم اسلام کے لیے ایک بہترین نمونہ ہے پیغمبرؐ نے اسی نمونہ کی خاطر در حقیقت ایزدی سے یہ ہجرت کی، لوگ کفار مکہ سے خوف و ہراس رکھنے کی وجہ یوں ہی بیان کرتے ہیں، خالق کائنات اپنے پیغمبر حقؐ کی جان کی حفاظت کر سکتا تھا ہجرت کا واقعہ دراصل اسلامی عالمگیر برادری کے لیے یہ سبق دیتا ہے کہ مسلمان کا وطن ہر کہیں ہے اور کہیں نہیں ہے ؎

عقدۂ قومیت مسلم کشود — از وطن آقائےؐ ما ہجرت نمود
آں کہ در قرآں خدا او را ستود — آنکہ حفظ جانِ او موعود بود
پس چرا از مسکنِ آبا گریخت؟ — تو گمان داری کہ از اعدا گریخت؟
قصہ گویان حق ز ما پوشیدہ اند — معنی ہجرت غلط فہمیدہ اند
ہجرت آئین حیات مسلم است — این ز اسباب ثبات مسلم است
بحر را آزادہ رفتن آبرواست — عرصۂ آفاق زیر پای اوست

(اسرار و رموز ۱۲۱-۲۰)

علامہ عالم اسلام پر ہمہ گیر نظر رکھتے تھے دنیا کے ہر گوشے کے مسلمانوں کے افتراق اور زوال پر انہوں نے آنسو بہائے اور ہر کسی کی جرأت و بے باکی، جہاد و ایثار اتحاد کو سراہا ہے، اس ضمن میں شواہد پیش کرنے کی ضرورت نہیں، ہر ایک کتاب میں کچھ نہ کچھ مربوط باتیں موجود ہیں، برصغیر کے مسلمانوں کا ذکر تو بے حد و حساب ہے۔ افغانوں کے افتراق پر وہ اس طرح دلسوزی کرتے ہیں ؎

اشتراں اند اخوت گرم خیز — او برادر با برادر در ستیز
ہست داری دل و غافل ز دل — تن ز تن اندر فراق و دل ز دل
میر خیل از مکر پنہانی بترس — از فغان روح افغانی بترس

(جاوید نامہ، مسافر)

ایران کے اوضاع پہلے سے بھی وہ نالاں رہے اور جب رضا شاہ کبیر نے اقتدار سنبھالا تو وہ بڑے ہی خوش ہوئے اور فرمایا ؎

می رسد مردی کہ زنجیرِ غلامان بشکند — دیدہ ام از روزنِ دیوارِ زندانِ شما

(زبورِ عجم)

ترکوں کی تحریک کے ساتھ سارے ہی برصغیر کے مسلمان زعما ایک وابستگی رکھتے تھے۔ اقبال کی اس وابستگی کو چند سطروں میں بیان نہیں کیا جا سکتا۔ ان کے کئی اشعار، نظمیں اور "تشکیل الہیات جدید" کی عبارات ترکوں کی تشویش یا تنقید میں ہیں۔ یہی حال طرابلس، ابی سینا اور ہماری تہذیب کے سابقہ مراکز اندلس اور سسلی وغیرہ کے بارے میں صادق آتا ہے۔

شاید ان کو سب سے زیادہ تکلیف عرب ممالک کے عدم اتحاد اور افتراق سے ہوتی تھی وہ جانتے تھے کہ وہ سب کچھ اہل مغرب اور ان کے ایجنٹوں کے ہاتھوں ہو رہا ہے وہ عربوں کو ان ریشہ دوانیوں اور زیر زمین اور خانہ برانداز سازشوں سے چوکنا رہنے کی تلقین فرماتے رہے کہتے ہیں کہ عربوں کو پہلے خود ایک ہونا چاہیے اور اس کے بعد وہ سارے عالم اسلام کو اپنے ساتھ رکھیں۔ اور دیگر ممالک کو اتحاد و اخوت کا درس دیں۔ ۵۰ سال ہونے کو ہیں عربوں کے سر پر جو مصیبت آئی۔ اس کی روشنی میں اگر علامہ کے کلام کا مطالعہ کیا جائے تو اس مرد حق و خود آگاہ کی حیرت انگیز بصیرت سامنے آتی ہے۔ جاوید نامہ (۲۰۱) اور پس چہ باید کرد (۵۱-۵۴) کے ابیات ملاحظہ ہوں ؎

ای فواد ای فیصل ای ابن سعود — تا کجا بر خویش پیچیدن چو دود؟
زندہ کن در سینہ آن سوزی کہ رفت — در جہان باز آور آن روزی کہ رفت
خاک بطحا، خالدی دیگر بزای — نغمۂ توحید را دیگر سرای
ای نخیل دشت تو بالندہ تر — بر نخیزد از تو فاروقی دگر؟
زندگانی تا کجا بی ذوق سیر — تا کجا تقدیر تو در دست غیر؟
حق ترا بُرّان تر از شمشیر کرد — ساربان را راکب تقدیر کرد
کار خود را امتان بردند پیش — تو ندانی قیمت صحرای خویش
اُمتی بودی، امم گردیدہ ای — بزم خود را خود ز ہم پاشیدہ ای
آنچہ تو با خویش کردی، کس نکرد — روح پاک مصطفیٰؐ آمد بدرد
ای ز افسون فرنگی بی خبر — فتنہ ہا در آستین او نگر
از فریب او اگر خواہی امان — اشترانش را ز حوض خود بران
تا عرب در حلقۂ دامش فتاد — آسمان یک دم امان او را نداد
عصر خود را بنگر ای صاحب نظر — در بدن باز آفرین روح عمرؓ
طبع از باد بیان کردہ تیز — ناقہ را سردہ بمیدان ستیز

اور "ضرب کلیم" (۶۱) کے ایک قطعے میں مردانِ عرب سے یوں مخاطب ہوتے ہیں ؎

کرے یہ کافر ہندی بھی جرأت گفتار — اگر نہ ہو امرائے عرب کی بے ادبی
یہ نکتہ پہلے سکھایا گیا کس امت کو — وصال مصطفویؐ، افتراق بولہبی

محمدِ عربی سے ہے عالمِ عربی | نہیں وجود حدود و ثغور سے اس کا

علامہ اسی طرح ملتِ اسلام کے غم میں گھلتے رہے۔ ارمغان حجاز (صفحہ ۱۰،۱۱،۷) کے چند قطعات دیکھیں ان میں وہ ملتِ اسلام کو نفریں کرتے اور اپنے آپ کو قابلِ ہمدردی بتاتے ہیں اور ایسے اشعار شاعرِ مشرق کے ایسے درد و غم کی غمازی کرتے ہیں جن کے تصور ہی سے آنکھیں پرنم ہو جاتی ہیں۔

مسلمان فاقہ مست و ژندہ پوش است | ز کارش جبرئیل اندر خروش است

بیا نقشِ دگر ملت بریزیم | کہ این ملت جہاں را بارِ دوش است

دلی بر کف نہادم، دلبری نیست | متاعی داشتم، غارت گری نیست

درونِ سینۂ من منزلی گیر | مسلمانی ز من تنہا تری نیست

بصدقِ فطرتِ اندازی من | بسوزِ آہِ بیتابانۂ من

بدہ آن خاک را ابرِ بہاری | کہ در آغوش دارد دانۂ من

ان سالوں میں عالمِ اسلامی کے اتحاد یا پان اسلامزم کی ضرورت پہلے سے زیادہ محسوس کی جا رہی ہے اگر عالمِ اسلام آپس میں اس طرح معنوی طور پر متحد ہو جائے جس طرح پاکستان، ایران اور ترکی نے اشتراک و ہم آہنگی دکھا دی ہے تو علامہ اور دیگر پان اسلامسٹوں کی آرزوؤں کے خوابوں کے شرمندۂ تعبیر ہونے میں زیادہ وقت نہیں لگے گا اور یہ اسی وقت ممکن ہو سکتا ہے جب اقبال کے مخاطب اول یعنی پاکستان کے مسلمان ہر قسم کے اختلافات فرقہ وارانہ، نسلی اور صوبائی، ترک کر کے ایک متحد و متفق ملت بن جائیں ورنہ اتحاد اتحاد کا صرف شور ہوتا رہے گا اور عملاً کچھ نہ ہو گا۔ خدائے تعالیٰ ہمیں قومی اور بین الاقوامی پیمانے پر متحد و متفق ہونے کی توفیق ارزانی فرمائے۔

عرب از سرشکِ خونم ہمہ لالہ زار بادا | عجم رمیدہ بو را نفسم بہار بادا

چو بجان من درآئی دگر آرزو نہ بینی | مگر اینکہ شبنم تو یم بی کنار بادا

(پیامِ مشرق صفحہ ۲۱۵-۲۱۶)

(ماخوذ)

انجمن کی زیرِ طبع کتابیں

۱۔ قاموس الکتب حصۂ دوم

۲۔ طنزیات و ملفوظات محفوظ علی

۳۔ بوطیقا (ارسطو) مترجم عزیز احمد

۴۔ تذکرۂ آزردہ (مفتی صدر الدین آزردہ)

اقبال کی شاعری میں انسان کا تصور اور اسکا مقام

نظیر صدیقی

اردو شاعری میں اسلام اور اسلامی تصوف کے اثر سے انسانی عظمت کا تصور جا بجا نظر آتا ہے۔ بیشتر شاعروں کے یہاں انسانی عظمت سے متعلق کچھ نہ کچھ شعر ضرور مل جاتے ہیں۔ بڑے شاعروں میں میرؔ، دردؔ اور غالبؔ کے بعض اشعار زبان زد عام ہیں۔ مثلاً

مت سہل ہمیں جانو پھرتا ہے فلک برسوں — تب خاک کے پردے سے انسان نکلتے ہیں

آدم خاکی سے عالم کو جلا ہے ورنہ — آئینہ تھا تو مگر قابلِ دیدار نہ تھا

میرؔ

باوجودیکہ پر و بال نہ تھے آدم کے — واں یہ پہنچا کہ فرشتوں کا بھی مقدور نہ تھا

دردؔ

ہیں آج کیوں ذلیل کہ کل تک نہ تھی پسند — گستاخیٔ فرشتہ ہماری جناب میں

غالبؔ

چونکہ اقبالؔ کے بنیادی افکار و اقدار اسلام ہی سے ماخوذ ہیں اس لیے ان کی شاعری میں انسانی عظمت کے تصور کی موجودگی کوئی نئی بات نہیں۔ لیکن انھوں نے انسانی عظمت پر اپنے ایمان کا اظہار جس قدر شد و مد کے ساتھ کیا ہے اور انسانی عظمت کے پیش نظر خدا اور انسان کے درمیان جو نئے رشتے دریافت کئے ہیں انھیں ان کی شاعری کے امتیازی خصوصیات میں شمار کرنا غلط نہ ہوگا۔ اپنی نظم "تسخیر فطرت" میں انھوں نے جس قدر پُرشکوہ انداز میں آدم کی پیدائش بیان کی ہے اس کی مثال عالمی شاعری میں بھی شاید ہی مل سکے ؎

نعرہ زد عشق کہ خونیں جگرے پیدا شد
حسن لرزید کہ صاحب نظرے پیدا شد
فطرت آشفت کہ از خاک جہان مجبور
خود گرے، خود شکنے، خود نگرے پیدا شد

صرف دو شعروں میں انسان کی عظمت اور انسان کا اتنا بلند تصور دنیا کے شاید ہی کسی شاعر نے پیش کیا ہو وہ بھی اتنے خوبصورت اور پُروقار انداز میں۔ ان چار مصرعوں میں انسان کے متعلق جو پانچ باتیں کہی گئی ہیں ان سے کوئی ایسا انسان برآمد نہیں ہوتا جو صرف شاعروں

اور منکروں کے تخیل میں رہتا ہو۔ اقبال کا یہ انسان انسانی تخیل کی بجائے انسانی تاریخ کا انسان ہے۔ وہ ایک تاریخی وجود رکھتا ہے۔ وہ فی الواقع ایک خونیں جگر، صاحب نظر، خودگر، خود شکن اور خودنگر مخلوق ہے۔ وہ خاک جہاں مجبوری سے پیدا ہوا لیکن وہ مجبور محض نہیں رہا۔ جبر و قدر کے مسئلے پر اقبال کے انداز فکر کی وضاحت کرتے ہوئے میں نے اپنے ایک مضمون میں لکھا تھا کہ

"اقبال نے انسان کے بے پناہ امکانات کو ماننے کے باوجود تسلیم کیا ہے کہ انسان محض مختار نہیں مجبور بھی ہے ......

اس سلسلے میں اقبال نے جو اہم نکتہ بتایا وہ یہ ہے کہ انسان کی مختاری اور مجبوری کے حدود معین اور مستقل نہیں ہیں۔ عمل کی بدولت انسان کے اختیارات کا دائرہ وسیع سے وسیع تر ہوتا چلا جاتا ہے اور اس کی مجبوریاں محدود تر ہوتی چلی جاتی ہیں۔ یہ ایک ایسا دعویٰ ہے جس کی تصدیق انسانی ارتقا کی پوری تاریخ سے ہوتی ہے۔ انسان نے مسلسل جدوجہد کی بدولت زمان و مکاں پر جو فتوحات حاصل کی ہیں انھوں نے اس کے اختیارات میں اتنے زبردست اضافے کئے ہیں کہ ان پر خود انسانی عقل حیران ہے ..."

غرض کہ مندرجہ بالا چار مصرعوں میں اقبال نے انسان کی جو پانچ صفتیں بتائی ہیں ان کی تصدیق انسانی تاریخ سے ہوتی ہے۔ انسانی تاریخ انسان کے خونیں جگر، صاحب نظر، خودگر، خود شکن اور خود نگر ہونے کی شہادت دیتی رہی ہے۔ انسان اپنی انہی صفات کی بدولت مناظر فطرت پر حکمرانی کرتا رہا ہے۔ نظام کائنات میں انسان کی مرکزی حیثیت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اقبال کہتے ہیں ؎

نہ تو زمیں کے لئے ہے نہ آسماں کے لئے
جہاں ہے تیرے لئے تو نہیں جہاں کے لئے

اقبال کی شاعری میں انسان اس دنیا کا مرکز اور اس کا حکمران ہی نہیں بلکہ اس ناتمام کائنات (بقول اقبال "یہ کائنات ابھی ناتمام ہے شاید") کی تخلیق، تہذیب اور تکمیل میں خدا کا معاون اور اس کی تخلیقات کا بہترین نقاد بھی ہے۔ خدا اور انسان کے درمیان کئی طرح کے رشتے موجود رہے ہیں۔ مثلاً خدا اور انسان کے درمیان خالق اور مخلوق، ساجد اور مسجود، عابد اور معبود، حاکم اور محکوم جیسے کئی رشتے روز ازل سے چلے آرہے ہیں۔ اقبال نے پہلی مرتبہ اس بات کا احساس دلایا کہ خدا اور انسان کے درمیان ایک رشتہ خالق اور معاون خالق کا بھی ہے۔ خدا یقیناً خالق اعظم ہے لیکن اس کی تخلیق کی تکمیل انسان کی تخلیقی صلاحیتوں پر منحصر رہی ہے۔ انسان کی تخلیقات خدا کی تخلیقات کے تکملے کی حیثیت رکھتی ہیں۔ یا پھر یوں سمجھئے کہ خدا کی تخلیقات انسان کے لئے خام مواد کی حیثیت رکھتی ہیں۔ انسان کی تخلیقات اس خام مواد کے مصرف کی ترجمانی کرتی ہیں۔

"پیام مشرق" میں اقبال کی ایک نہایت خوبصورت اور مختصر نظم ہے "محاورہ مابین خدا و انسان" اس میں خدا انسان سے ازراہ شکایت کہتا ہے ؎

جہاں را ز یک آب و گل آفریدم　　تو ایران و تاتار و زنگ آفریدی
من از خاک پولاد ناب آفریدم　　تو شمشیر و تیر و تفنگ آفریدی
تبر آفریدی نہال چمن را
قفس ساختی طائر نغمہ زن را

جواب میں انسان خدا سے کہتا ہے ؎

تو شب آفریدی چراغ آفریدم　　سفال آفریدی ایاغ آفریدم
بیابان و کہسار و راغ آفریدم　　خیابان و گلزار و باغ آفریدم

من آنم کہ از سنگ آئینہ سازم
من آنم کہ از زہر نوشینہ سازم

اس نظم کے پہلے حصے میں جہاں یہ ظاہر کیا گیا ہے کہ انسان کی تخلیقات تخریبی ہیں وہاں دوسرے حصے میں اس بات پر اصرار کیا گیا ہے کہ انسان کی تخلیقات نہ صرف تعمیری ہیں بلکہ تکمیلی بھی۔ خدا کے تصور کے ساتھ اس کی جو صفت سب سے پہلے ذہن میں آتی ہے وہ اس کی بے پناہ قوت تخلیق ہی ہے۔ خدا کی اس صفت میں اگر کوئی مخلوق شریک اعظم کی حیثیت رکھتی ہے تو وہ انسان ہے۔ اس باب میں انسان خدا کا مدمقابل تو نہیں کہا جا سکتا لیکن اسے خدا کا معاون ضرور قرار دیا جا سکتا ہے۔ انسان کی یہ حیثیت جس کی نشاندہی پہلے پہل اقبال نے کی نہ صرف اس کی عظمت پر دلالت کرتی ہے بلکہ خدا کے ساتھ اس کے نئے رشتے پر بھی۔ لیکن انسانی عظمت کے معاملے میں اقبال انسان کو خدا کا صرف معاون قرار دینے پر قناعت نہیں کرتے بلکہ اسے خدا جیسے عظیم یا عظیم ترین فن کار کا نقاد بھی ظاہر کرتے ہیں۔

مجھ کو پیدا کر کے اپنا نکتہ چیں پیدا کیا — نقش ہوں اپنے مصور سے گلہ رکھتا ہوں میں
گفت یزداں کہ چنین است و دگرہیچ مگو — گفت آدم کہ چنین است و چناں می بایست

طرح نو افگن کہ ما جدت پسند افتادہ ایم — ایں چہ حیرت خانۂ امروز و فردا ساختی؟

جدت پسندی اور تازہ کاری اقبال کے انسان کی بنیادی خصوصیات ہیں۔ چھوٹے قد کے اس پیکر خاکی کو اگر قدرت کے بڑے بڑے مظاہر پر برتری حاصل ہے تو خصوصیات انہی کی بدولت ہے

فروغ آدم خاکی ز تازہ کاریہاست
مہ و ستارہ کنند آنچہ پیش ازیں کردند

اقبال کے ذہن پر انسان کا جو تصور غالب رہا کرتا ہے وہ خدا کے مقابلے میں اس کے خالق ثانی یا موجد ثانی ہونے کا تصور ہے۔ ان کے نزدیک انسان خدا کے کام کی تہذیب و تکمیل کرنے والے کی حیثیت رکھتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اقبال خدا کی تخلیق کردہ دنیا کے معائب اور نقائص کو دیکھ کر برہم اور بیزار نہیں ہوتے بلکہ اسے انسان کا فرض سمجھتے ہیں کہ وہ ان معائب اور نقائص کو دور کر کے دنیا کو اپنی خواہشوں اور خوابوں کے مطابق بنائے ؎

بے ذوق نہیں اگرچہ فطرت
جو اس سے نہ ہو سکا وہ تو کر

کسی کو بڑی ذمہ داری سونپنا بھی اس کی عظمت کا اعتراف ہے۔ اقبال کے یہاں انسانی عظمت کے اعتراف میں اسالیب کا جو تنوع ملتا ہے وہ شاید ہی کسی اور شاعر کے یہاں مل سکے۔ وہ انسانی مرتبے کی بلندی کو کہیں یوں ظاہر کرتے ہیں کہ انسان کو خدا کا رفیق کار اور خدا کی کارکردگی کا نقاد گردانتے ہیں اور کہیں اس کے رتبے کو آسمان سے بھی بلند تر قرار دیتے ہیں ؎ برتر از گردوں مقام آدم است۔ لیکن اقبال انسان کی عظمت کا گیت صرف اس لئے نہیں گاتے کہ وہ ایک رومانی شاعر کی حیثیت سے انسان کو جذباتی خراجِ تحسین پیش کرنا چاہتے ہیں۔ اقبال کے یہاں انسانی عظمت انسانی تہذیب کی کسوٹی کی حیثیت رکھتی ہے ان کے نزدیک اصل تہذیب وہی ہے جس میں آدمی کا سچا احترام پایا

جاتا ہو گا اصل تہذیب احترام آدم است۔ جب وہ اس نقطۂ نظر سے آج کل کی سب سے بڑی تہذیب یعنی مغربی تہذیب کو دیکھتے ہیں تو اس میں نظر کو خیرہ کرنے والی چمک پانے کے باوجود یہ کہے بغیر نہیں رہتے کہ یہ صناعی مگر جھوٹے نگوں کی ریزہ کاری ہے۔ یہ تہذیب اس وقت تک وجود میں نہیں آسکتی جب تک انسان انسان کا شکار کرتا رہے گا۔

مغربی تہذیب کا ایک پہلو حد درجہ حیرت انگیز ہے۔ وہ یہ کہ عہد حاضر میں مغربی سائنس نے جس قدر شاندار کارنامے انجام دیئے ہیں اسی قدر مغربی ادب کا انسان ذاتی بے اہمیتی کے احساس میں مبتلا ہے۔ دور حاضر کے برطانوی نقاد اور مفکر کولن ولسن نے اپنی خیال انگیز اور بصیرت افروز کتاب The age of Defeat میں انسان کی بے اہمیتی کے احساس کو "بے اہمیتی کا مغالطہ" قرار دیا ہے اور اس بات پر شدید جھلاہٹ کا اظہار کیا ہے کہ مغربی ادب کا انسان اس مغالطے میں کیوں مبتلا ہے کہ اس کی کوئی اہمیت نہیں۔ اس میں انسانی عظمت کا احساس کیوں مفقود ہے اور وہ اپنے ماحول و معاشرہ پر غالب آنے کی اہمیت اور طاقت اپنے اندر کیوں نہیں پاتا۔ بیسویں صدی کے مغربی فکشن کے تقریباً تمام ہیرو شکست خوردہ انسان کیوں نظر آتے ہیں؟

میرا خیال ہے کہ اگر کولن ولسن اقبال کی شاعری سے واقف ہوتا تو اسے یہ دیکھ کر بڑا اطمینان ہوتا کہ بیسویں صدی میں ایک مشرقی شاعر ایسا بھی گزرا ہے جس کی شاعری مغربی ادب میں انسان کی بے اہمیتی کے شدید احساس کی تلافی کر رہی ہے۔ ولن شعر و ادب میں جس انسانی عظمت کو جویا ہے اس کا نہایت پُرجوش اور مکمل اظہار اقبال کی شاعری میں موجود ہے۔

کولن ولسن نے بڑے ادب کی ایک خصوصیت یہ بتائی ہے کہ بڑا ادب انسانی عظمت اور انسانی فلاکت کے پس منظر میں تخلیق کیا جاتا ہے۔ یعنی بڑا ادب بیک وقت انسانی عظمت اور انسانی فلاکت کا ترجمان ہوتا ہے۔ اگر اقبال کی شاعری کو اس معیار سے پرکھا جائے جب بھی کسی کو اقبال کی شاعری سے مایوسی تو نہ ہو گی لیکن یہ ضرور محسوس ہو گا کہ اقبال کی شاعری میں جس قدر انسان کی عظمت اجاگر ہوئی ہے اس قدر انسان کا دکھ اجاگر نہیں ہو سکا ہے۔ اقبال جس حد تک انسانی عظمت کے مقر ہیں اس حد تک انسانی فلاکت کے مصور نہیں ہیں۔ لیکن اس کمی یا کوتاہی کے باوجود اتنا تسلیم کرنا پڑے گا کہ وہ انسان کی ایک بنیادی فلاکت اور ایک بنیادی المیے کی نشاندہی کر گئے ہیں۔ اس لحاظ سے ان کی صرف ایک نظم زمانۂ حاضر کا انسان، بیسویں صدی کے اس تمام ادب پر بھاری ہے جو انسان کی فلاکت اور انسان کے المیے پر لکھا گیا ہے۔ دوسرے لکھنے والوں نے انسانی المیے کی جو تفصیل اپنے ادب پاروں میں پیش کی ہے اس کا نچوڑ اقبال نے دو مصرعوں میں یوں پیش کر دیا ہے ؎

جس نے سورج کی شعاعوں کو گرفتار کیا
زندگی کی شب تاریک سحر کر نہ سکا

اس سے بڑی انسانی فلاکت اور اس سے بڑا انسانی المیہ اور کیا ہو سکتا ہے؟

اقبال کے خطوط

رفیع الدین ہاشمی

مکاتیب اقبال مستقل اور باقاعدہ تصنیف کی حیثیت نہیں رکھتے لیکن وہ ان کے خیالات اور فلسفہ و افکار کے اظہار اور شرح و وضاحت میں ان کی شعری اور نثری تصانیف سے کم اہم نہیں اور اس اعتبار سے تو مکاتیب کی اہمیت مستقل تصانیف سے بھی بڑھ جاتی ہے کہ وہ اقبال کی شخصی زندگی اس کے گوناگوں رجحانات اور نفسیاتی و جذباتی کیفیتوں کے ترجمان ہیں۔ جب کہ تصانیف میں یہ اتنی وضاحت اور شرح و بسط کے ساتھ موجود نہیں ہیں۔

برصغیر کے سینکڑوں اور ہزاروں افراد کو علامہ اقبال سے ملنے اور ان کے ساتھ نشست و برخاست اور گفتگو کا موقع ملا۔ بیسیوں خوش قسمت افراد ایسے بھی تھے جنہیں شب و روز علامہ کی صحبتوں سے مستفید ہونے اور سفر و حضر میں ان کے حضور رہنے کا اتفاق ہوا۔ مگر ان صحبتوں، محفلوں اور گفتگوؤں اور شب و روز کے نقشوں اور سفر و حضر کی کیفیتوں کو اب تک بہت ہی کم قلم بند کیا جا سکا ہے۔ یہ ذخیرہ اس قدر کم ہے کہ اقبال کی شخصیت کے بہت سے گوشے بدستور پردۂ ابہام میں رہ جاتے ہیں اقبال ایسے مفکر، فلسفی اور شاعر کہیں صدیوں میں پیدا ہوتے ہیں۔ ایسے رجل عظیم کی زندگی کا ایک ایک لمحہ، ان لمحوں میں رونما ہونے والے واقعات، ان واقعات کی نوعیت اور ان کا پس منظر اپنی جزئیات و کیفیات کے ساتھ تمام و کمال محفوظ ہونا چاہیے تھا کیونکہ اقبال کی عظمت اس کی متقاضی تھی لیکن افسوس کہ یہ کام خاطر خواہ طریقے سے نہیں کیا گیا۔ اقبال کے سوانح نگار اگر چاہتے تو بڑی حد تک اس کمی کو پورا کر سکتے تھے مگر ابھی تک ڈھنگ سے اقبال کی کوئی سوانح ہی نہیں لکھی جا سکی اس صورتحال میں مکاتیب کا وجود غنیمت ہے۔ مکاتیب میں حیات اقبال کے بہت سے واقعات محفوظ ہیں اور بہت سے ان گوشوں پر روشنی پڑتی ہے جو سوانح نگاروں کی نظروں سے اوجھل رہے اور ان کا ریکارڈ کسی دوسری جگہ نہیں ملتا۔ مکاتیب غالب کے بارے میں مولانا غلام رسول مہر نے لکھا ہے کہ خطوں میں حیات غالب کا ایک ایک لمحہ موجود ہے اور اسے ترتیب دے کر غالب کی اچھی سوانح عمری ترتیب دی جا سکتی ہے۔ بعینہٖ یہی بات مکاتیب اقبال کے بارے میں کہی جا سکتی ہے نہ صرف یہ کہ مکاتیب اقبال کی ایک جامع سوانح حیات کے لئے ٹھوس اور مستند مواد فراہم کرتے ہیں بلکہ مکاتیب کے ذریعہ ان کی شخصیت و نفسیات کے بعض دلچسپ گوشے سامنے آتے ہیں اور ان کے شعر و فلسفہ کی تشریح بھی ہوتی ہے۔

اقبال خط کا جواب لکھنے میں بہت باقاعدہ اور مستعد تھے ان کے بہت سے خطوں میں اس طرح کے فقرے ملتے ہیں "کل آپ کا خط ملا۔" "ابھی ایک لمحہ پہلے آپ کا خط پہنچا۔" "آپ کا نوازش نامہ ابھی ابھی موصول ہوا"۔ مکاتیب کے ذخیرے پر ایک نگاہ ڈالنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ چند ایک مغتنم خطوط کو چھوڑ کر اقبال نے ہر جواب میں امکانی حد تک اختصار سے کام لیا ہے۔ خط کے جواب میں تعجیل اور مستعدی اور اختصار کے درمیان گہرا ربط موجود ہے اور اس سے اقبال کا ایک شخصی رجحان ظاہر ہوتا ہے۔

اقبال کے بارے میں سب جانتے ہیں کہ زندگی کے معمولات میں وہ کوئی بہت مستعد اور باقاعدہ شخص نہ تھے۔ بالکل ابتدا ہی سے ان کی

طبیعت میں ٹھہراؤ اور جمود کا رجحان تھا۔ پابندیوں اور ضابطوں سے گھبراتے تھے۔ زمانۂ طالب علمی میں جب وہ گورنمنٹ کالج لاہور کے ہوسٹل میں قیام پذیر تھے۔ انہیں بی اے کا طالب علم ہونے کے سبب علیحدہ کمرہ ملا ہوا تھا۔ اس کمرے میں فرشی نشست جمتی، حقے کا دور چلتا، اور گھنٹوں گپ شپ رہتی۔ اقبال میر مجلس ہوتے۔ میر غلام بھیک نیرنگ، جو ایسی مجلسوں کے چشم دید گواہ ہیں۔ بیان کرتے ہیں کہ "اقبال کی طبیعت میں اسی وقت سے ایک گونہ قطبیت تھی اور وہ "قطب از جائی جنبد" کا مصداق" تھے[15] پابندیوں سے گھبراہٹ کا رجحان اس سے بھی ظاہر ہوتا ہے کہ پنجاب یونیورسٹی کے قانون کے امتحان میں ایک بار فیل ہونے کے بعد دوبارہ امتحان میں بیٹھنا چاہتے تھے تو یونیورسٹی میں درخواست دی کہ لیکچررز میں حاضر ہونے کی پابندی سے مستثنیٰ قرار دیا جائے۔ یونیورسٹی کے ضابطے کے مطابق استثنیٰ کی گنجائش نہ تھی اس لئے یونیورسٹی نے اجازت نہ دی۔ اور اقبال امتحان میں نہ بیٹھ سکے۔ سرکاری ملازمت سے گریز بھی اسی رجحان کا نتیجہ تھا لباس کے معاملے میں وہ بڑے بے تکلف اور لاپروا واقع ہوئے تھے۔ ایک بنیان اور تہمد پہنے گھر میں پڑے رہتے تھے کہیں جانا انہیں بہت گراں گزرتا تھا۔ سر عبدالقادر لکھتے ہیں۔ "اقبال کے ہم نشین جن میں میں بھی شامل تھا کبھی کبھی ان کو "قطب از جائی جنبد" کہہ کر چھیڑا کرتے تھے۔ کیونکہ وہ نقل و حرکت کے معاملے میں بہت تساہل برتا کرتے تھے[16] کاہلی، جمود، لاپروائی اور بے قاعدگی کے اوصافِ طبع کے ساتھ ایک عام شخص سے خطوں کے جواب میں مستعدی، تعجیل، اور بے قاعدگی کی توقع عبث ہے لیکن اقبال کی شخصیت اس معاملے میں استثنائی شان رکھتی ہے۔ متذکرہ بالا اوصاف طبع کے باوجود ان کا باقاعدگی سے خط کا جواب لکھنا ان کی قلندرانہ طبیعت کا ایک پہلو ہے۔ ایسا قلندر اور درویش جو اپنی تمام تر بے نیازی کے باوجود اسلامی اخلاقیات کے اصولوں کو زندگی کے کسی مرحلے پر بھی فراموش نہیں کر سکتا۔ سلام کا جواب دینا اور خط کا جواب لکھنا اسلامی اخلاقی فرض کا بنیادی تقاضا ہے چنانچہ اسی وجہ سے خط کا جواب لکھنا اقبال کے نزدیک مذہبی اور اخلاقی فرض کی ادائیگی سے کم نہ تھا۔ خط کے جواب میں تعجیل اور باقاعدگی اقبال کے احساسِ ذمہ داری اور فرض شناسی کا نتیجہ تھا۔ طبعی اوصاف و رجحانات انسان کے ہر کام میں کسی نہ کسی حد تک مزور دخل اندازی کرتے ہیں۔ اس لئے اقبال کی مکتوب نگاری میں باقاعدگی ایک زبردست احساس ذمہ داری کا نتیجہ ہونے کے باوجود ان کی سہل انگاری اور بے نیازی کے رجحان کی دخل اندازی سے نہیں بچ سکی۔ مکاتیب کا اختصار اسی دخل اندازی کا نتیجہ ہے۔ ایک طرف ادائیگی فرض جواب کا تقاضا کرتی ہے اور دوسری طرف رجحان طبع کے ہاتھوں مجبور ہیں کہ اس تکلف اور پابندی سے جلد نجات ملے چنانچہ مکاتیب کے بین السطور میں اس کشمکش کی جھلک صاف دیکھی جا سکتی ہے۔ کبھی خط پر تاریخ لکھ دی کبھی بھول گئے۔ خیال آگیا تو آخر میں لکھ دی ورنہ بلا تاریخ ہی خط روانہ کر دیا کبھی تاریخ اور مہینہ لکھ دیا اور سن ندارد۔ کبھی خط ختم کرنے کی جلدی میں الفاظ چھوٹ گئے۔ احساس فرض کے ساتھ خط لکھنا شروع کیا مگر جلد ہی طبیعت اکتا گئی چنانچہ "زیادہ کیا عرض کروں" قسم کا فقرہ لکھ کر خط ختم کر دیا۔ یہ فقرہ اقبال نے اپنے خطوں کے آخر میں کثرت سے دہرایا ہے۔ خط سے جلد چھٹکارا پانے کے رجحان کو اقبال شعوری طور پر خود بھی محسوس کرتے تھے۔ منشی سراج الدین صاحب کے نام ایک خط لکھا اور خط کے آخر میں ایک "تازہ غزل بھی نقل کر دی۔ خط کچھ ایسا طویل نہیں اور غزل بھی چند اشعار کی ہے۔ لیکن غزل نقل کرنے کے بعد لکھتے ہیں:۔

---

[15] "اقبال کے بعض حالات" مجلۂ اقبال" اکتوبر ۱۹۵۷ء ص ۵

[16] ادبی دنیا۔ اقبال نمبر ۱۹۶۷ء ص ۴۳

"کاغذ ختم ہوگیا۔ دل بھی اکتا گیا۔ میں سمجھتا ہوں، میں نے بڑی ہمت کی کہ اتنے اشعار نقل کر لیے اور آپ کو خط بھی لکھ لیا۔ الحمدللہ" [17]

اکبر الہ آبادی کے نام ایک خط میں لکھتے ہیں :۔

"کئی دفعہ ارادہ کیا کہ آپ کی خدمت میں استدعا کروں کہ خط ذرا لمبا لکھا کیجیے مگر میں خود لمبا خط لکھنے سے گھبراتا ہوں۔ پھر میرا کوئی حق نہیں کہ آپ کو لمبا خط لکھنے کی زحمت دوں" [18]

گویا طویل خط لکھنا، اقبال کے نزدیک باعثِ زحمت تھا اور وہ اس زحمت سے اکثر گریز کرتے تھے بلکہ یہ زحمت اٹھانے کی وہ اپنے میں ہمت ہی نہیں پاتے تھے۔ مکاتیب کے دو مزید اقتباس دیکھیے :

"دوسرے سوال کا جواب بہت طویل ہے مگر افسوس کہ طویل خط لکھنے کی نہ ہمت ہے نہ خواہش" [19]

"آپ کے خط کا جواب حقیقت میں طویل ہے لیکن افسوس کہ میں طویل خط لکھنا تو درکنار، معمولی خط و کتابت سے بھی قاصر ہوں" [20]

فی الواقع اقبال جیسے آزاد منش انسان کے لیے بڑی ہمت کا کام تھا کہ انہوں نے اپنی طبعی سہل انگاری کے علی الرغم کثرت سے خطوط لکھے اور یوں ہمارے لئے مکاتیب کا ایک بڑا ذخیرہ فراہم کر گئے۔

مکاتیب اقبال میں جو خطوط نسبتاً مفصل ہیں، تعجب ہے کہ وہ یا تو قطعی ذاتی اور پرائیویٹ ہیں، یا بالکل عمومی نوعیت کے، جن کا موضوع علمی اور اجتماعی دلچسپی سے متعلق ہے۔ پہلی قسم کے خطوط عطیہ فیضی کے نام ہیں۔ اور قطعی پرائیویٹ نوعیت کے ہیں کیونکہ اس قسم کے خیالات اقبال نے اپنے کسی اور مکتوب الیہ کے سامنے کبھی ظاہر نہیں کیے۔ عطیہ فیضی کو لکھتے ہیں :

"آپ میرے بارے میں سب کچھ جانتی ہیں۔ اور اسی وجہ سے میں نے اپنے خیالات کو الفاظ کا جامہ پہنانے کی جرأت کی ہے" [21]

یہ خطوط حیاتِ اقبال کے ایک خاص دور میں ان کی ذہنی و نفسیاتی کیفیتوں کی ترجمانی کرتے ہیں۔ اس دور میں بعض اوقات اقبال حسرت و حرماں نصیبی کا شکار نظر آتے ہیں۔ انہیں شدتِ جذبات کے سبب قلبی کیفیت کو الفاظ کا جامہ نہیں مل رہا۔ اقبال اور کچھ نہیں کر سکتے تو اپنے آپ پر ہنستے ہوئے اپنا یہ شعر پڑھ دیتے ہیں ؎

اقبال بھی اقبال سے آگاہ نہیں ہے
کچھ اس میں تمسخر نہیں، واللہ نہیں ہے

---

[17] اقبال نامہ حصہ اول ص ۲۲
[18] اقبال نامہ حصہ دوم ص ۳۹
[19] اقبال نامہ حصہ دوم ص ۲۳۹
[20] اقبال نامہ حصہ اول ص ۲۰۵
[21] اقبال از عطیہ فیضی ص ۵۲

ان خطوط میں ایک طرح کی تلخی ضرور ہے مگر بناوٹ نہیں۔ اقبال کی صاف گوئی اور کھرا پن قابلِ داد ہے۔ ان کا خلوص اور سادہ دلی ان خطوں سے ٹپکی پڑتی ہے۔ یہ خطوط ذخیرۂ مکاتیب میں اس لئے زیادہ اہم ہیں کہ ان سے اقبال کے بعض ایسے خیالات اور ذہنی وارداتوں کا پتہ چلتا ہے جن کا اندازہ ان کے عزیز ترین دوستوں اور احباب کو بھی نہ ہو سکتا تھا۔ اور نہ اقبال نے خود ان احساسات کو کہیں اور بیان کیا ہے۔

مکاتیب مفصّل کی دوسری قسم وہ ہے، جن میں اقبال نے بعض علمی نکات و معارف پر بحث کی ہے۔ اپنے کلام اور افکار کی تشریح کی ہے اور اعتراضات کا جواب دیا ہے اور بعض علمی اور تعلیمی منصوبوں کی وضاحت کی ہے [۲۲] اسی طرح بعض دیگر مباحث پر اظہارِ خیال کیا ہے جن کا تعلق مکتوب الیہ کی ذات کے ساتھ ساتھ اجتماعی طور پر پورے معاشرے اور ملک و ملّت سے ہے۔

اقبال کی شاعری پڑھ کر ہم مشرق کے عظیم شاعر سے متعارف ہوتے ہیں تو مکاتیب اقبال ہمیں ایک عظیم انسان کی شخصی عظمت کا قائل کرتے ہیں۔ خطوط کے بین السطور ہمیں اقبال ایک ایسے مردِ مومن کے روپ میں نظر آتے ہیں جس نے اسلامی اخلاقیات کے تمام عالی شان اصولوں کو اپنی شخصیت میں سمو لیا ہے۔ خطوں کے جواب میں عجلت اور باقاعدگی بجائے خود احساسِ فرض شناسی کا بہت بڑا ثبوت ہے اس پر مزید یہ اہتمام کہ کسی کی دل شکنی نہ ہو، ممکن حد تک ہر ایک کی حوصلہ افزائی کی جائے۔ ہر ایک کا احترام کیا جائے۔ ان خطوط سے اقبال کا طبعی عجز و انکسار، نام و نمود سے گریز، بے تعصبی اور علمی لگن، غیرتِ فقر اور قناعت پسندی کا اظہار ہوتا ہے۔ محمد عبداللہ قریشی لکھتے ہیں:

> "اقبال کے ذاتی اوصاف، اخلاص و محبت، مسلم دوستی، وسیع مطالعہ، اسلام سے شیفتگی، مسلمانوں کی زبوں حالی پر دلسوزی اور اصلاحِ احوال پر توجہ، دوستوں سے مروت اور عالمِ انسانیت سے محبت کا پتہ ان خطوں کی سطر سطر سے چلتا ہے" [۲۳]

غرض مکاتیب میں، اقبال کی عظمتِ کردار کا ایک مثالی نمونہ نظر آتے ہیں۔ چند جھلکیاں ملاحظہ ہوں:

> "اردو زبان میں آپ سے زیادہ نہیں جانتا کہ آپ کے کلام کو اصلاح دوں" [۲۴]

> "میری طرح امتِ مرحومہ میں سینکڑوں آدمی گذر گئے جنہوں نے رکاوٹوں کے ہوتے ہوئے کام کیا ہے۔ مجھ سے جہاں تک ہو سکے گا، انہیں کی تقلید کروں گا" [۲۵]

> "میں بڑے بڑے مجمعوں میں محض اس لیے نہیں جایا کرتا کہ لوگ دیکھتے ہیں اور کہتے ہیں اقبال

---

[۲۲] ملاحظہ ہو اقبال نامہ حصہ اوّل ص ۴۰۔ اور حصہ دوم ص ۵۳، ۱۰، ۲۱۲، ۳۱۳

[۲۳] مقدمہ مکاتیب اقبال بنام گرامی ص ۶۹

[۲۴] انوارِ اقبال ص ۱۱۰

[۲۵] مکاتیب اقبال بنام خان محمد نیاز الدین خاں ص ۴۶

آیا۔ مجھے اس قسم کی شہرت سے بہت الجھن ہوتی ہے" [۲۶]

"افسوس ہے آپ کا ترجمہ میری ناقص رائے میں اشاعت کے قابل نہیں ہے آپ کو اس کی اشاعت سے روکنا نہیں چاہتا۔ اگر آپ چاہیں تو مجھے اس کی اشاعت میں کوئی اعتراض نہیں" [۲۷]

"حیدری صاحب نے مجھ پر ایک مزید عنایت کی اور وہ یہ کہ اقبال ڈے کے موقع پر حضور نظام کے توشہ خانے سے بھی ایک ہزار روپیہ عطا فرمایا مگر افسوس کہ میں اس عطیے کو قبول نہ کر سکا" [۲۸]

"مولانا حسین احمد مدنی سے سخت اختلاف کے باوجود میں ان کے احترام میں کسی مسلمان سے پیچھے نہیں ہوں" [۲۹]

"نہ بحث کرنا میرا شعار ہے بلکہ جہاں کہیں بحث ہو رہی ہو وہاں سے گریز کرتا ہوں" [۳۰]

"ذاتی رائے میری خواہ کچھ ہی کیوں نہ ہو، اگر علماء کا فتوٰی میری ذاتی رائے کے خلاف ہو تو سرِ تسلیم خم ہے" [۳۱]

یہ اقتباسات درحقیقت اقبال کے اس قول کی تشریح ہیں کہ "اقبال کی زندگی مومنانہ نہیں، لیکن اس کا دل مومن ہے" [۳۲] ذاتی خوبیوں کے علاوہ عظمت کردار کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ عظیم انسان دوسروں کی بڑائی کا کھلے دل کے ساتھ اعتراف کرتا ہے اقبال کی وسعت قلبی اور فراخ دلی کا یہ عالم ہے کہ خواجہ حسن نظامی سے حافظ کے مسئلے پر شدید اختلافات پیدا ہو گئے اقبال کے بقول خواجہ مرحوم نے ان پر بہتان تک باندھے لیکن اقبال ان کی علمیت اور ادبیت کے معترف ہیں۔ اسی طرح اکبر الہ آبادی سے محبت اور عقیدت کا اظہار اور وفات پر ان کی عظمت کا اعتراف درحقیقت خود اقبال کی عظمت کی دلیل ہے۔ علماء اور بزرگوں کے نام خطوط خلاف معمول عجلت علماء اور بزرگوں کے نام خطوط خلاف معمول عجلت اور سہل انگاری سے پاک ہیں ایسے خطوں میں انھوں نے مکتوب الیہم کے لئے جو القاب و آداب استعمال کئے ان سے بزرگوں کے لئے اقبال کی گہری اور قلبی عقیدت و محبت کا آشکارا ہے۔ مولانا سید انور شاہؒ کے لئے "مخدوم و مکرم حضرت قبلہ مولانا" پیر سید مہر علی گولڑوی کے لئے "مخدوم و مکرم حضرت قبلہ مولانا شبلی کے لئے" مخدوم و محترم جناب قبلہ مولوی صاحب" سید سلیمان ندوی کے لئے "مخدومی جناب قبلہ مولینا" اکبر الہ آبادی کے لئے "مخدوم و مکرم جناب قبلہ سید صاحب" - القاب میں تبدیلی ہوتی ہے مگر احترام و آداب برقرار رہتا ہے۔ علماء اور بزرگوں کے نام خطوط میں اقبال کا انداز بہت محتاط اور مودبانہ ہے۔ وہ برابر مکتوب الیہ کی علمیت اور عظمت کا تذکرہ اور اپنے عجز، انکسار اور ہیچمدانی کا اعتراف کرتے ہیں۔ بزرگوں سے اپنی غلطیوں کی اصلاح چاہتے ہیں بلکہ وہ اصرار کرتے ہیں کہ انہیں ان کی غلطیوں سے آگاہ کیا جائے اکثر اپنے کلام کے بارے میں علماء کی رائے جاننے کے مشتاق رہتے ہیں۔

"مہربانی کر کے غزل کے تمام اشعار پر اعتراض لکھئے تاکہ میں پورے طور پر مستفید ہو سکوں" (مولانا گرامی کے نام) [۳۳]

---

[۲۶] مکاتیب اقبال بنام خان محمد نیاز الدین خان ص ۴۴
[۲۷] انوار اقبال ص ۱۱۶
[۲۸] انوار اقبال ص ۱۳۴
[۲۹] انوار اقبال ص ۱۶۷
[۳۰] اقبال نامہ حصہ دوم ص ۱۹۱
[۳۱] مکاتیب اقبال بنام خان محمد نیاز الدین خان ص ۳۵
[۳۲] اقبال نامہ حصہ اول ص ۲۰۷

"مطلع فرمائیے کہ جو اشعار میں نے اپنے خطوط میں لکھے ہیں، ان کی نسبت آپ کی کیا رائے ہے"

(سید سلیمان ندوی کے نام) [۳۴]

"نظرِ ثانی کے وقت آپ کی تنقیدوں سے فائدہ اٹھاؤں گا۔ اگر میری ہر نظم کے متعلق آپ اس قسم کا خط لکھا کریں تو میں آپ کا نہایت ممنون ہوں گا"

(نواب صدر یار جنگ حبیب الرحمٰن شروانی کے نام) [۳۵]

"رموزِ بیخودی کی لغزشوں سے آگاہ کرنے کا وعدہ آپ نے کیا تھا۔ اب تو ایک ماہ سے بہت زیادہ عرصہ ہو گیا ہے، امید ہے کہ توجہ فرمائی جائے گی"

(سید سلیمان ندوی کے نام) [۳۶]

"یہ بالکل ممکن ہے کہ میں نے شیخ کا مفہوم غلط سمجھا ..... اس وقت بھی مجھے اپنے خیال کے لئے کوئی ضد نہیں ... ملتمس ہوں کہ آپ ازراہ عنایت و مکرمت چند ارشادات تسطیر فرمائیں۔ میں ان ارشادات کی روشنی میں خصوص و فتوحات کو پھر دیکھوں گا اور اپنے علم اور رائے میں مناسب ترمیم کر لوں گا"

(سید سلیمان پھلواری کے نام) [۳۷]

ابھی مکاتیب اقبال کے بعض القاب و آداب کا ذکر ہوا تھا۔ مجموعی طور پر مکاتیب کے اقبال میں بڑا تنوع اور رنگا رنگی ہے۔ اقبال القاب کے انتخاب میں مکتوب الیہ کی شخصیت اس کے مقام و مرتبے اور اس کے ساتھ اپنے تعلقات کی نوعیت کو نظر انداز نہیں کرتے کبھی ایک ہی مکتوب الیہ کے لئے مختلف اوقات میں مختلف القاب و آداب استعمال کرتے ہیں۔ اجنبیوں کے لئے جناب، جناب من، مخدومی وغیرہ جیسے سادہ القاب استعمال ہوتے ہیں۔ اقبال کے آداب و القاب کے چند نمونے ملاحظہ ہوں:

آل احمد سرور : جناب من

سرکشن پرشاد: سرکار والاتبار۔ سرکار والا

بابائے اردو مولوی عبدالحق: مخدومی جناب مولنا۔ مخدومی جناب مولوی صاحب

ڈاکٹر محمد عبداللہ چغتائی: ڈیئر ماسٹر عبداللہ۔ ڈیئر ماسٹر صاحب، جناب ماسٹر صاحب

مولانا اکبر شاہ خان نجیب آبادی: مخدومی مولوی صاحب۔ مخدومی۔ ڈیئر مولانا۔ جناب مولانا۔

اس سلسلے میں ایک دلچسپ اور قابل ذکر بات یہ ہے کہ بعض دوستوں کے ساتھ اقبال کے نہایت قریبی اور بے تکلفانہ روابط تھے چنانچہ ان کے نام خطوں کے القاب میں وہی بے تکلفی اور اسی قدر تنوع پایا جاتا ہے۔ مثلاً مولانا گرامی سے جس غایت درجہ قلبی تعلق تھا ان کے نام خطوں کے القاب بھی اتنے ہی بوقلموں ہیں۔

---

۳۴ اقبال نامہ حصہ اول ص ۸۸　　۳۵ ـــــ ایضاً ـــــ ص ۵

۳۶ ـــــ ایضاً ـــــ ص ۸۴　　۳۷ انوار اقبال ص ۱۲۹

جناب بابائے گرامی سلمہ۔ مخدومی جناب مولانا مولوی گرامی صاحب۔ ڈیر مولانا گرامی۔ باباگرامی۔ شاعرِ خاص حضور نظام
جناب مولانا گرامی۔ جناب مولانا گرامی مدظلہٗ العالی۔ ڈیر گرامی۔ جناب مولانا گرامی۔ حضرت گرامی۔

اسی طرح خواجہ حسن نظامی سے جس زمانے میں اقبال کی بے تکلفانہ دوستی تھی، اس دور کے خطوط میں اقبال نے ان کے لئے حسب ذیل القاب استعمال کئے ہیں:

مکرمی سیّد صاحب زاد عمرہٗ۔ اسرار قدیم سیّد حسن نظامی۔ پُراسرار نظامی۔ پیارے نظامی۔ مخدومی خواجہ صاحب۔ مکرمی۔ سرمست کو سلام۔ مخدومی و مکرم جناب خواجہ صاحب۔ خواجہ صاحب مکرم۔ ڈیر خواجہ صاحب

اور اسی پر اکتفا نہیں بلکہ بے تکلف احباب کے نام خطوں میں اقبال کی شخصیت کا وہ پہلو بھی منعکس ہے جس کا تعلق ان کی طبعی شگفتگی، ظرافت اور حسِ مزاح سے ہے۔ اقبال نجی محفلوں، اور پرائیویٹ گفتگوؤں میں بڑے بذلہ سنج، خوش گفتار اور ظریف انسان تھے۔ بے تکلف دوستوں خصوصاً مولانا گرامی کے نام خطوں میں اس شگفتہ طبعی کا اظہار اکثر ہوتا ہے:

"آپ کہاں ہیں؟ حیدر آباد میں یا عدم آباد میں؟ اگر عدم آباد میں ہوں تو مجھے مطلع کیجئے کہ تعزیت نامہ لکھوں"۔ ۳۸ھ

"گرامی سال خوردہ ہے یعنی سالوں اور برسوں کو کھا جاتا ہے پھر بوڑھا کیونکر ہو سکتا ہے بوڑھا تو وہ ہے جس کو سال اور برس کھا جائیں" ۳۹ھ

"آپ کا تخلص گرامی کی جگہ نومی ہونا چاہئے کیونکہ آپ سوتے بہت ہیں معلوم ہوتا ہے راون لنکا کے بادشاہ کی طرح آپ چھ ماہ سوتے ہیں اور چھ ماہ جاگتے ہیں۔ حیدر آباد کی شاہی میں تبدیلی ہوئی وزارت بدل گئی مگر آپ ابھی اونگھ رہے ہیں۔ برائے خدا کبھی اپنی خیریت سے مطلع کیا کرو۔ آپ کے بہت سے لاہوری دوست استفسار کرتے ہیں کہ ان کو خط لکھ کر جگایئے مگر اس کے لئے شورِ محشر کی ضرورت ہے۔ خطوں سے کیا ہوتا ہے" ۴۰ھ

(بنام مولانا گرامی)

"مولانا گرامی صاحب ابھی آلام و افکار سے آزاد نہیں۔ عرصہ ہوا میں نے انہیں خط لکھا تھا مگر ان کے لئے خط کا جواب دینا ایسا ہی ناممکن ہے جیسا کہ روس کا موجودہ حالت میں جرمنی سے لڑ سکنا" ۴۱ھ

"گرامی صاحب نے وعدہ کیا تھا کہ محرم میں تشریف لائیں گے مگر اکونی لائیونی" ۴۲ھ

"گرامی صاحب نے شاید ملک الموت کو کوئی رباعی کہہ کر ٹال دیا ہے اور کیا تعجب کہ ہجو کہنے کی دھمکی دی ہو" ۴۳ھ

۳۸ھ مکاتیب گرامی ص ۹۷
۳۹ھ مکاتیب گرامی ص ۱۵۱
۴۰ھ مکاتیب اقبال گرامی ص ۹۶
۴۱ھ مکاتیب اقبال بنام خان نیاز الدین خاں ص ۸
۴۲ھ ـــــ ایضاً ـــــ ص ۱۰
۴۳ھ ـــــ ایضاً ـــــ ص ۱۳

"آپ کے کبوتر بہت اچھے ہیں مگر افسوس کہ زمانۂ حال کی مغربی تہذیب سے بہت متاثر معلوم ہوتے ہیں۔ مقصود اس سے یہ ہے کہ بچوں کی پرورش سے بہت بیزار ہیں" [۴۴]

(بنام خان نیاز الدین خاں مرحوم)

"تمام لاہور میں اس بات کا چرچا ہے کہ ماسٹر عبداللہ اعلانِ آزادی کے خوف سے کہیں بھاگ گئے ہیں۔ کیا یہ واقعی درست ہے؟" [۴۵]

(بنام ڈاکٹر محمد عبداللہ چغتائی)

۵

مکاتیب اقبال میں مختلف علمی، تاریخی، معاشی اور فلسفیانہ مسائل زیر بحث آئے ہیں۔ اقبال نے اپنے مکتوب الیہم کے ساتھ قرآن، حدیث، فقہ، تصوف اور دین و شریعت کے مختلف پہلوؤں پر تبادلۂ خیال کیا ہے اور مختلف تحریکوں، ان کے اصولوں اور نظریات پر نقد و تبصرہ اور اپنے ردِ عمل کا اظہار کیا ہے۔ ان ساری بحثوں میں اقبال کا اندازِ استدلال بہت علمی، منطقی، اور ٹھوس ہے۔ کئی خطوط میں انہوں نے اپنے بعض نظریات و تصورات کی وضاحت کی ہے، مثلاً نظریۂ خودی، تصورِ شاہین، تصوف، اجتہاد وغیرہ ـــ اس طرح مکاتیب اقبال کے اس قول کی روشنی میں کہ "شاعر کے لٹریری اور پرائیویٹ خطوط اس کے کلام پر روشنی ڈالتے ہیں" [۴۶]، شعرِ اقبال کی تشریح و تفسیر بھی بن گئے ہیں۔

نظری اور تصوراتی بحثوں کے دوران میں اور کبھی اس کے علاوہ ہی اقبال نے ایسے حکیمانہ نکات و معارف بیان کیے ہیں جو بظاہر مختصر ہیں مگر جامعیت اور گہری معنویت کے اوصاف کے حامل ہیں۔ یہ ایک عظیم مفکر اور فلسفی کے بلند پایہ اقوال کی حیثیت رکھتے ہیں:

"حدودِ خودی کے تعین کا نام شریعت ہے اور شریعت اپنے قلب کی گہرائیوں میں محسوس کرنے کا نام طریقت ہے۔" [۴۷]

"مخلص مسلمان اپنے مصائب کو بھی خدا تعالیٰ کے قرب کا ذریعہ بنا لیتا ہے۔" [۴۸]

"اکثر انسانوں کو کنج تنہائی میں بیٹھے ہمہ دانی کا دھوکا ہو جاتا ہے۔ ان کا قصور نہیں، فطرتِ انسان ہی اس قسم کی ہے۔" [۴۹]

"ایک ہی قسم کا شوق رکھنے والوں کی صحبت بعض دفعہ ایسے نتائج پیدا کر جاتی ہے جو کسی کے خیال و خواب میں بھی نہیں ہوتے" [۵۰]

---

[۴۴] مکاتیب اقبال بنام خان نیاز الدین خاں ص ۳۹
[۴۵] اقبال نامہ حصہ دوم ص ۳۵۰
[۴۶] انوار اقبال ص ۱۱
[۴۷] اقبال نامہ حصہ اول ص ۲۰۲
[۴۸] انوارِ اقبال ص ۷۳
[۴۹] اقبال نامہ حصہ اول ص ۱۱
[۵۰] ایضاً ص ۲۸

"زندہ زبان انسانی خیالات کے انقلاب کے ساتھ بدلتی رہتی ہے اور جب اس میں انقلاب کی صلاحیت نہیں رہتی تو مُردہ ہو جاتی ہے" [۵۱]

"طاقت کا سرچشمہ فراست ہے" [۵۲]

"کاغذ کے نقوشِ بے جان سے الفاظ کی آواز زیادہ موثر ہوتی ہے۔ کاغذ جذباتِ انسانی کی حرارت کا کب متحمل ہوتا ہے اور کئی امور ایسے بھی تو ہوتے ہیں جن کا ضبطِ تحریر میں لانا مناسب نہیں ہوتا" [۵۳]

O

مکاتیبِ اقبال، تصانیفِ اقبال کے پسِ منظر کا کام دیتے ہیں۔ اقبال کے مدّاح اور اس کی شاعری کے دلدادگان بار بار مجموعہ ہائے کلام کے بارے میں استفسار کرتے یا کسی نظم یا شعر کی وضاحت چاہتے۔ ایسے استفسارات کے جواب میں اقبال نے مختلف اوقات میں اپنے بعض اشعار و منظومات کی شانِ نزول، ان کے سیاق و سباق کے ساتھ بیان کی ہے۔ شعری مجموعوں کے تکمیلی مراحل، ترتیب و تدوین اور طباعت و اشاعت حتیٰ کہ جلد بندی تک کے بارے میں تفصیلی معلومات خطوں میں جا بجا بکھری ہوئی ہیں جن کی بنیاد پر تصانیفِ اقبال کی مفصّل تاریخ مع اس کے پسِ منظر کے، مرتب کی جاسکتی ہے۔

مکاتیب سے اقبال کے مستقبل کے بعض تصنیفی منصوبوں کا پتہ چلتا ہے جن کے مطابق وہ قرآن، فقہ، تصوف اور اجتہاد وغیرہ کے متعلق مندرجہ ذیل مضامین و کتب لکھنا چاہتے تھے۔

(۱) مقدمۃ القرآن
(۲) تاریخِ تصوفِ اسلامیہ
(۳) حیاتِ مستقبلۂ اسلامیہ
(۴) اپنے قلب و دماغ کی سرگذشت
(۵) اصولِ فقہ پر تنقیدی نگاہ
(۶) اسلام میرے نقطۂ نظر سے
(۷) فصوص الحکم پر تنقید۔
(۸) SONGS OF MODERN DAVID
(۹) رامائن (اردو میں)

اور یوں مکاتیب، اقبال کی مجوزہ و موعودہ تصانیف کا پورا نقشہ پیش کرتے ہیں۔

---

۵۱ اقبال نامہ حصہ اول ص ۵۶
۵۲ ــــــ ایضاً ــــــ ص ۴۳۵
۵۳ اقبال نامہ حصہ دوم ص ۱۴۲

اپنی شعری عظمت کی بنا پر اقبالؔ دنیائے شعروادب میں ایسے بلند مقام پر فائز تھے کہ نو آموز بڑی کثرت سے اپنی شعری کاوشیں اصلاح کی خاطر ان کی خدمت میں بھیجا کرتے تھے۔ اقبال نے اگرچہ شاگرد بنانے سے گریز ہی کیا تاہم اصلاحِ شعر کی بہت سی مثالیں ان کے خطوں میں ملتی ہیں۔ کبھی وہ الفاظ کی تحقیق میں کوشاں نظر آتے ہیں۔ اور کبھی کسی حوالے کی تلاش میں سرگرداں۔ پھر ہمعصر شخصیتوں سے علمی، ادبی اور شعری مسائل پر تبادلۂ خیالات ہوتا رہتا تھا۔ بعض خطوں کے جواب میں اقبال کو شعروادب اور نقدوانتقاد کے متعلق اپنا نقطۂ نظر واضح کرنا پڑتا۔ چنانچہ مکاتیب اقبال، ان کے شعورِ تحقیق وتنقید اور شعری وادبی نقطۂ نظر کی وضاحت کرتے ہیں بلکہ اس سے ان کے تبحرِ علمی اور وسعتِ مطالعہ کا بھی پتہ چلتا ہے۔

ابتدا میں ذکر کیا گیا کہ اقبال کی کوئی ڈھنگ کی سوانح عمری نہیں لکھی گئی۔ اقبال کی حیات پر جو کتب ملتی ہیں اول تو وہ مختصر ہیں دوسرے ان میں تحقیق واستناد کی کمی ہے۔ مکاتیب اقبال ان کمیوں کو پورا کرتے ہیں۔ وہ حیاتِ اقبال کے بارے میں ایسی جامع اور مفصل رپورٹ مہیا کرتے ہیں جو مکاتیب کے سوا کہیں بھی ریکارڈ میں موجود نہیں۔ ان کے خطوط میں ان کے شب وروز کے معمولات، مصروفیات ومشاغل، پسند وناپسند، ماضی کے تذکرے، حال کی کیفیات اور مستقبل کے منصوبوں کی مکمل وجامع تفصیلات ملتی ہیں۔ ان کے ذریعے نہ صرف اقبال بلکہ ان کے بزرگوں، اعزا واقربا، دوستوں، عزیزوں اور اولاد سے بھی متعارف ہوتے ہیں۔ اقبال کے خطوط ان کے یورپ، فلسطین، جنوبی ہند، افغانستان، دہلی، شملہ اور بلوچستان کے سفروں اور دوروں کی روداد بھی پیش کرتے ہیں۔ حتیٰ کہ خطوط سے اقبال کے مختلف سفروں کی تاریخیں اور اوقات تک متعین کیے جاسکتے ہیں۔ مختلف اوقات میں اقبالؔ کے جسمانی عوارض خصوصاً آخری علالت کی ابتدا، اس میں اضافے، اس کی بدلتی ہوئی کیفیتوں، علاج، دواؤں اور ان کے اثرات کی تفصیل خطوں میں بیان ہوئی ہے۔ اسی طرح والدۂ جاوید کی بیماری کی مختلف حالتیں بھی مکاتیب میں موجود ہیں۔ صحت بیماری اور علاج معالجے کی تفصیلات زیادہ تر سید نذیر نیازی اور ڈاکٹر پروفیسر مظفرالدین کے نام خطوط میں بیان ہوئی ہیں۔

مکاتیب اقبال کا بہت بڑا ذخیرہ اردو میں ہے۔ انگریزی میں خط وکتابت کرنے والے احباب کی تعداد بہت قلیل تھی۔ جواب لکھتے ہوئے اگر انتخابِ زبان کا مسئلہ محض اقبال پر منحصر ہوتا تو شاید وہ خطوں کے جواب ہمیشہ انگریزی میں لکھتے۔ کیونکہ وہ اپنے بقول "اردو میں گفتگو کرتے ہوئے۔۔۔۔ اپنے مافی الضمیر کو اچھی طرح ادا" نہیں کرسکتے تھے۔ شاید اسی سبب سے ایسے خطوط، جن میں وارداتِ قلبی یا کسی جذبے کا اظہار مقصود تھا۔ انگریزی میں لکھے گئے۔ مکاتیب بنام عطیہ فیضی اور نذیر نیازی کے نام ایک خط[۵۴] اس کی عمدہ مثال ہیں۔ اگر اقبال کے مکتوب الیہم کی اکثریت نے انہیں اردو میں خطوط لکھے۔ (اور اس سے وہ منطقی طور پر اقبال کی طرف سے اردو میں ہی جواب کی توقع رکھتے تھے)۔ اگر اقبال کے عقیدت مندوں اور محبوں کے خطوط اردو میں نہ ہوتے تو شاید مکاتیبِ اقبال کا اتنا بڑا ذخیرہ اردو زبان میں وجود میں نہ آتا۔ تاہم اقبالؔ نے اردو میں اپنے عجزِ بیان کا جو ذکر کیا ہے وہ ان کی کسرِ نفسی کا ایک رخ ہے۔ ان کے سینکڑوں اردو خطوط اس کا ٹھوس ثبوت ہیں کہ وہ نہ صرف اظہارِ مطالب پر پوری طرح قادر تھے بلکہ ان کی قدرتِ زبان نے خطوط کو اسلوبِ بیان کی بوقلمونی صفات کا حامل بنا دیا ہے۔

---

[۵۴] مکتوباتِ اقبال بنام نذیر نیازی ص ۲۹

مکاتیب میں اقبال کی نثر کا رنگ و آہنگ مکتوب الیہ کی شخصی حیثیت کے اعتبار سے تبدیل ہوتا رہتا ہے ایسے خطوط جن میں نظری مسائل اور علمی و فکری موضوعات پر بحث ہے سنجیدہ استدلال سے مزین ہے ان خطوں میں نثر کا اسلوب نستا ٹھوس اور جاندار ہے لکھنے والا بڑے تیقن سے اپنی بات کہتا نظر آتا ہے ایسے خطوط یا خطوط کے حصے حقائق و معارف علمیہ کے آئینہ دار ہونے کے باوجود خشکی اور بے کیفی سے خالی ہیں۔ ان میں ایک نوعیت کے جذب و انجذاب کی کیفیت پائی جاتی ہے اور اس وجہ سے ایسی تحریروں میں متاثر کرنیکی صفت نمایاں ہے۔ ڈاکٹر سید عبداللہ نے ایسی ہی عبارتوں کو "حکیمانہ نثر" ۵۵ کا نام دیا ہے:

"گرانی مسلم ہے اور مسلم تودۂ خاک نہیں کہ خاک اسے جذب کر سکے۔ یہ ایک قوت نورانیہ ہے جو جامع ہے جواہر موسویت اور ابراہیمیت کی۔ آگ اسے چھو جائے تو برد و سلام بن جائے پانی اس کی ہیبت سے خشک ہو جائے آسمان و زمین میں یہ سما نہیں سکتی کہ یہ دونوں ہستیاں اس میں سمائی ہیں پانی آگ جذب کر لیتا ہے عدم بود کو کھا جاتا ہے پستی بلندی میں سما جاتی ہے مگر جو قوت جامع اضداد ہو اور محلل تمام تناقضات کی ہو اسے کون جذب کرے مسلم کو موت نہیں چھو سکتی کہ اس کی قوت حیات و موت کو اپنے اندر جذب کر کے حیات و ممات کا تناقض مٹا چکی ہے" ۵۶

یہ اقبال کی تحریر کا ایسا نمونہ ہے جس کے متعلق ڈاکٹر سید عبداللہ نے لکھا ہے کہ "نثر کی علمی تحریروں میں بھی انہوں نے عرب کو نظر انداز نہیں کیا" ۵۷ سبب اس کا یہ ہے کہ اقبال کے بقول ان کی تہذیب کی روح عربی ہے اور تحریر میں تہذیب کا انعکاس ناگزیر ہے بلاشبہ اقبال نے کہیں کہیں قواعد کے اصولوں کا سختی سے خیال نہیں رکھا کبھی ان سے بعض الفاظ یا حروف چھوٹ جاتے ہیں مگر یہ غلطیاں ایسی معمولی اور اتنی کم ہیں کہ انہیں آسانی سے نظر انداز کیا جا سکتا ہے ایسی غلطیاں اقبال کے عجز بیان کا نتیجہ نہیں بلکہ تحریر کی برجستگی عجلت اور خط پر نظر ثانی نہ کرنے کا نتیجہ ہیں۔

جناب محمد عبداللہ قریشی مکاتیب کے اسلوب نگارش پر بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں "کہ اقبال کی دیگر علمی تحریروں کی طرح ان کی عبارت میں رعب و دبدبہ بھی ہے اور وزن بھی: فکر کی جولانی بھی ہے اور خیال کی برجستگی بھی۔ بعض بعض جگہ تو شاعری نثر سے ہم آغوش نظر آتی ہے ۵۸ قریشی صاحب کی رائے کے ثبوت میں ذیل میں بیانیہ نثر کا ایک اقتباس ملاحظہ کیجیے۔ اقبال نے اپنے طور پر مافی الضمیر ادا نہ کر سکنے کا جو مفروضہ قائم کیا ہے یہ عبارت اس کی مکمل طور پر تردید ہی نہیں کرتی بلکہ اقبال کے شاندار ادیبانہ اسلوب کی نشاندہی بھی کرتی ہے:

"یہ کنال (نہر سویز) جسے ایک فرانسیسی انجینئر نے تعمیر کیا تھا دنیا کے عجائبات میں سے ایک ہے۔ عرب اور افریقہ کی جدائی ہے اور مشرق و مغرب کا اتحاد ہے دنیا کی روحانی زندگی پر مہاتما بدھ نے بھی اس قدر اثر نہیں

---

۵۵ "مقالات اقبال" کا دیباچہ بعنوان "جسارت" ص ۱۳

۵۶ اقبال نامہ حصہ اول ص ۱۳-۱۴

۵۷ "مقالات اقبال" کا دیباچہ بعنوان "جسارت" ص ۱۳

۵۸ مقدمہ مکاتیب اقبال بنام گرامی ص ۸۵

کیا جس قدر اس مغربی اختراع نے زمانۂ حال کی تجارت پر کیا ہے۔ کسی شاعر کا قلم اور کسی سنگ تراش کا ہنر اس شخص کے تخیل کی داد نہیں دے سکتا جس نے اقوام عالم میں اس تجارتی تغیر کی بنیاد رکھی۔" [59]

مکاتیب میں سادگی اور سلاست اقبال کے اسلوب تحریر کا خاص وصف ہے۔ اسی وجہ سے وہ فقروں کی بناوٹ میں طوالت سے پرہیز کرتے ہیں۔ چھوٹے چھوٹے فقرے ان کی اختصار پسند طبیعت سے فطری مناسبت رکھتے ہیں۔ اس سے سادگی بیانی قائم رہتی ہے اور اثر آفرینی بھی بڑھ جاتی ہے۔ مثلاً

"اب اسلامی جماعت کا محض خدا پر بھروسہ ہے۔ میں بھلا کیا کر سکتا ہوں، صرف ایک بے چین اور مضطرب جان رکھتا ہوں۔ قوتِ عمل مفقود ہے۔ ہاں یہ آرزو رہتی ہے کہ کوئی قابل نوجوان جو ذوق خدا داد کے ساتھ قوتِ عمل بھی رکھتا ہو، مل جائے جس کے دل میں اپنا اضطراب منتقل کر دوں۔" [60]

غرض مکتوب کی نوعیت خواہ کچھ ہو۔ سادہ بیانی نثرِ اقبال کا بنیادی وصف ہے۔ ان خطوط ہر طرح کے اغلاق، پیچیدگی اور الجھاؤ سے پاک ہیں۔ یوں اسلوب کے سلسلے میں مکاتیب اقبال کی امتیازی خصوصیت یہ ہے کہ بوقلمونی تحریروں کے باوجود اقبال کی سادہ بیانی بااہتمام قائم ہے۔ مختصر یہ کہ اقبال کے خطوط بھی ان کی شاعری کی طرح پُر لطف، دلآویز اور حکمت و فلسفہ سے مملو ہیں۔ کوئی شخص اگر چاہے تو وہ خطوط پڑھ کر بھی ویسا ہی محظوظ ہو سکتا ہے جیسا کہ شاعری پڑھنے سے ہوتا ہے۔ یہ ان کی سیرت و شخصیت اور فکر و فلسفے کا ایسا مرقع ہے جس میں ان کی شخصی زندگی کا ہر رنگ نظر آتا ہے اور ساتھ ہی ان کے نظریات کی وضاحت بھی ہوتی ہے۔

---

[59] اقبال نامہ حصہ دوم ص ۲۶۸ - ۲۶۹

[60] ایضاً ص ۴۹

دسویں صدی ہجری کی ادبی روایت کا سراغ

دیوان حسن شوقی

مرتبہ

جمیل جالبی

قیمت: پانچ روپے

انجمن ترقی اردو۔ کراچی - ۱

اقبال کا حرفِ شیریں

یونس حسنی

قومی زبان کے گزشتہ کئی شماروں میں اقبال کا شعر ؎

محمد بھی ترا جبریل بھی قرآن بھی تیرا
مگر یہ حرفِ شیریں ترجماں تیرا ہے یا میرا

زیر بحث رہا ہے۔ خواجہ تہور حسین صاحب، سجاد نقوی صاحب اور ڈاکٹر محمد ریاض صاحب نے اپنے اپنے طور پر شعر کو سمجھنے کی کوشش کی ہے۔ مجھے ان حضرات کی فہم و فراست کا اعتراف ہے۔ شعر کو مختلف نہج سے سمجھا جا سکتا ہے اور اس کی ایک سے زیادہ تعبیریں بھی ممکن ہیں اس لیے اختلاف رائے کی گنجائش بھی موجود ہے۔ لیکن شعر فہمی کے لیے ایک بنیادی اصول یہ بھی ہے کہ جس شاعر کا شعر زیر بحث ہو اس کے مزاج، افتاد اور طرزِ فکر کو ذہن میں رکھتے ہوئے ایسا مفہوم اخذ کرنا جو اس کی افتادِ طبع اس کے اندازِ فکر اور اس کے مزاج شعری سے تعلق رکھتا ہو صحیح اور بہتر اندازِ تفہیم ہے۔ دوسرے تمام طریقے غلط تعبیروں یا دور کی کوڑی لانے کی تعریف میں آتے ہیں۔

اگر اس اصول کو صحیح سمجھ لیا جائے تو پھر زیر بحث شعر کو سمجھنے کے لیے اقبال کی فکر اساس اور ان کی غزلوں کے مزاج کو ذہن میں رکھنا ہوگا اقبال عظمت آدم کے نقیب ہیں۔ وہ انسان کو خلیفۃ اللہ فی الارض اور وجہ تخلیق کائنات سمجھتے ہیں۔ ان کا یہ نقطہ نظر ان کی نظموں اور غزلوں میں اس کثرت سے زیر بحث آیا ہے کہ اس سے انکار ممکن نہیں۔

زیر بحث شعر جس غزل سے ماخوذ ہے اسے غزل مسلسل کا نام نہ دیجیے۔ لیکن اس غزل کے ماحول میں ایک یکسانی ضرور ہے۔ مجھے خواجہ تہور حسین صاحب کے اس خیال سے اتفاق نہیں ہے کہ چونکہ غزل کے باقی تمام اشعار میں استفہام کا جواب "تیرا" ہے اس لیے اس شعر کے استفہام کا جواب بھی تیرا ہی ہونا چاہیے۔ البتہ مجھے ان سے اس قدر اتفاق ضرور ہے کہ غزل کے تمام اشعار کی روح ایک ہے اور وہ ہے عظمت آدم۔ مثلاً پہلے شعر میں مجھے (یعنی آدم بحیثیت نمائندہ اولاد آدم) فکر جہاں اس لیے نہیں ہے کہ یہ تیرا درد سر ہے۔ کائنات کے لیے میں نہیں میرے لیے کائنات ہے۔ اگر مجھے پیدا کیا ہے تو کائنات کی درستی کی فکر تو ہی کر اسی طرح اگر ہنگامہ ہائے شوق سے لامکاں خالی ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ لامکاں وجود آدم سے بے نیاز ہے اور ہنگامہ ہائے شوق علامت وجود آدم ہیں۔ صبح ازل انکار کی جرأت کرنے والا تیرا معتمد تھا۔ وہ اس اعتماد کا اہل ثابت نہیں ہو سکا۔ اس پر اعتماد کرنا تیرا قصور تھا ورنہ لائق اعتماد تو آدم ہی ہے۔ اور پھر سب سے آخر میں زوال آدم خاکی، اگر واقع ہوگا تو نقصان آدم کا نہیں۔ تیری قوت تخلیق اور تیری تدبیر پر حرف آجائے گا۔ گویا عروج آدم

خاکی تیرے منصوبے کا مقصد آفریں ہے پھر اگر اس کو زوال ہوا تو نقصان کس کا ہے۔ ؟ ان اشعار کے مفاہیم سے بخوبی اندازہ ہو جاتا ہے کہ اس غزل میں بنیادی طور پر سارے اشعار کی رو سارواں عظمت آدم ہے اس لیے کوئی وجہ نہیں کہ یہ ایک شعر اس سے مستثنیٰ ہو۔ اب آیئے اصل شعر کی طرف ؎

محمد بھی ترا، جبریل بھی، قرآن بھی تیرا مگر یہ حرف شیریں ترجماں تیرا ہے یا میرا

مصرع اولیٰ میں مسند الیہ قرآن ہے۔ محمدؐ اور جبریل کا ذکر ضمنی ہے اور حامل قرآن اور امین قرآن ہونے کی حیثیت سے ہے۔ یعنی قرآن تیری کتاب لانے والا تیرا فرشتہ، اٹھانے والا تیرا پیغمبر سب کچھ تیرا ہی تو ہے۔

دوسرے مصرعے میں اہم لفظ ہے "مگر" اور اس کے معنی ہرگز "اور" نہیں ہے۔ کوئی ایسا قرینہ بھی موجود نہیں کہ مگر کے معنی اور مراد لیے جائیں۔ مگر کے معنی "لیکن" ہی ہیں اور جب تک کوئی واضح قرینہ موجود نہ ہو اس کے معنی "اور" لینے میں بڑی قباحت ہے۔ دوسرے مصرعے میں شاعر کہتا ہے کہ اگرچہ مذکورہ تینوں "عناصر" کتاب حامل کتاب اور امین کتاب تیرے ہی ہیں مگر یہ "حرف شیریں" (حرف شیریں صنعت ہے مسند الیہ قرآن کی) ترجمانی کس کی کرتا ہے ؟ جواب ہے میری۔ قرآن انسان کے لیے نازل ہوا، اس کی رہنمائی اور ہدایت اس کا مقصد ہے شاعر کا مفہوم یہ ہے کہ اگرچہ قرآن، حامل قرآن اور امین قرآن سب تیرے ہیں مگر یہ سب جو فرائض انجام دے رہے ہیں وہ میری فلاح و بہبود ہے۔ یہی مفہوم ہے جو غزل کی مجموعی فضا سے بھی ہم آہنگ ہے اور اقبال کے افکار، خیالات اور مذاقِ شعری سے بھی لگا کھاتا ہے اگر حرف شیریں سے مراد کلام اقبال لیا جائے تو مگر کے معنی اور قرار دینا پڑیں گے اور شعر میں کوئی حسن بھی برقرار نہ رہے گا پھر یہ اقبال کے کہنے کا شعر تو رہے گا نہیں۔

رہا یہ سوال کہ اس شعر میں طنز ہے، ظرافت یا شاعرانہ تعلی تو میرے خیال میں اس شعر بلکہ اس غزل میں وہی چیز ہے جسے سجاد نقوی صاحب نے بجا طور پر معرفت ذات کی وہ منزل قرار دیا ہے جہاں کھڑے ہو کر اقبال نے شکوہ میں ذات برتر سے "بے تکلفانہ باتیں" کی ہیں یہ اگر طنز ہے تو شیریں ہے۔ اگرچہ ہے ایک "بندۂ گستاخ" کی طرف سے مگر گستاخی ہرگز نہیں۔

آخر میں ایک بات اور ـــــ بعض حضرات نے اس شعر کی تحسین کے دوران "حرف شیریں ترجماں" کو ایک ترکیب خیال کیا ہے جو قطعاً غلط ہے۔ "حرف شیریں" ترکیب ہے۔ اور ترجماں بمعنی ترجمانی کرنے والا علیحدہ لفظ ہے جسے ترکیب میں شامل کرنا شعر فہمی کو رسوا کرنا ہے۔

غالب ـــــ فکر و فن

مطالعۂ غالب کے سلسلے میں ڈاکٹر شوکت سبزواری درجۂ استناد رکھتے ہیں انھوں نے غالب کی شخصیت، اس کے ماحول اور فن کے بارے میں وقتاً فوقتاً جو مقالات لکھے ہیں انھیں اس کتاب میں جمع کر دیا گیا ہے۔ قیمت: پانچ روپے

انجمن ترقی اردو پاکستان، بابائے اردو روڈ کراچی ۱

علّامہ اقبالؔ کا مسلکِ تصوّف

تنویر کومشر

میں نے جب کبھی بھی علّامہ اقبالؔ کی شاعری کا بغور مطالعہ کیا تو احساس ہوا کہ ان کے اکثر اشعار کسی درویش دل ریش کے دل کی صدائیں ہیں جو اپنی (انسان) حقیقت کو سمجھ کر بے چین ہے کہ کاش ہر انسان اپنی مخفی حقیقتوں سے آشنا ہو جائے اور ایک ایسا معاشرہ وجود میں آئے جو خالق باری کے حسبِ منشا ہو۔

بے جا نہ ہوگا اگر اس تمہید میں اس غلط فہمی کی تردید کر دی جائے جو علّامہ اقبالؔ کے زمانے سے چلی آ رہی ہے کہ آپ تصوّف کے مخالف تھے جو انسان کو حرارت اور حرکت سے بے نیاز بنا کر "رہبانیت" کی تعلیم دیتا ہے۔ کیونکہ آپ "کوشش بے ہودہ بہ از خفتن" کے قائل تھے۔ آپ کے عہد میں سب سے زیادہ قابل ذکر شخصیت خواجہ حسن نظامی دہلوی کی ہے۔ کیونکہ انھوں نے مثنوی "اسرارِ خودی" پر بہت زیادہ اعتراضات کیے تھے۔ علّامہ نے ۲۰ دسمبر ۱۹۱۵ء کو خواجہ حسن نظامی دہلوی کے نام ایک خط لکھا جس کا ایک ایک لفظ گواہ ہے کہ آپ تصوف کے مخالف نہیں تھے بلکہ وہ اپنا ایک خاص مسلک رکھتے تھے۔ وہ خط مندرجہ ذیل ہے:۔

لاہور - ۲۰ دسمبر ۱۹۱۵ء

مخدومی خواجہ صاحب السلام علیکم۔ آپ کا والا نامہ ملا آپ کی علالت کا حال معلوم کر کے تردد ہوتا ہے، اللہ تعالیٰ صحت عاجل عطا فرمائے۔

مجھے خوب معلوم ہے کہ آپ کو اسلام اور پیغمبر اسلام (صلعم) سے عشق ہے پھر یہ کیونکر ممکن ہے کہ آپ کو ایک اسلامی حقیقت معلوم ہو جائے اور آپ اس سے انکار کریں؟ بلکہ مجھے ابھی سے یقین ہے کہ بالآخر آپ میرے ساتھ اتفاق کریں گے۔ میری نسبت بھی آپ کو معلوم ہے، میرا فطری اور آبائی میلان تصوّف کی طرف ہے اور یورپ کا فلسفہ پڑھنے سے یہ میلان اور بھی تیز ہو گیا تھا کیونکہ یورپین فلسفہ بحیثیت مجموعی وحدت الوجود کی طرف رخ کرتا ہے۔ مگر قرآن میں تدبر کرنے اور تاریخِ اسلام کا بغور مطالعہ کرنے سے مجھے اپنی غلطی کا احساس ہو گیا اور میں نے محض قرآن کی خاطر اپنے قدیم خیال کو ترک کر دیا اور میں اس مقصد کے لیے مجھے اپنے فطری اور آبائی رجحانات کے ساتھ ایک خوفناک دماغی اور قلبی جہاد کرنا پڑا۔

رہبانیت اور اسلام پر مضمون ضرور لکھوں گا، لیکن آپ کے مضمون کے بعد، رہبانیت عیسائی مذہب کے ساتھ خاص نہیں ہے بلکہ ہر قوم میں پیدا ہوئی اور ہر جگہ اس نے قانونِ شریعت سے مقابلہ کیا اور اس کے اثر کو کم کرنا چاہا ہے۔ اسلام درحقیقت اسی رہبانیت کے خلاف ایک صدائے احتجاج ہے۔

تصوّف جو مسلمانوں میں پیدا ہوا اور اس جگہ تصوّف سے میری مراد ایرانی تصوف ہے۔ اس نے ہر قوم کی رہبانیت سے زیادہ اثر

ہے، اور ہر دینی تعلیم کو اپنے اندر جذب کرنے کی کوشش کی ہے، یہاں تک کہ قرمطی تحریک کا مقصد بھی بالآخر قیودِ شرعیہ اسلامیہ کو فناء کرنا تھا، اور بعض صوفیا کی نسبت تاریخی شہادت موجود ہے کہ وہ اس تحریک سے تعلق رکھتے تھے۔

اب تک جو اعتراضات آپ کی طرف سے ہوئے ہیں وہ مثنوی کے دیباچہ پر ہوئے ہیں نہ کہ خود مثنوی پر۔ اس لیے جب تک مجھے یہ نہ معلوم ہو کہ مثنوی پر آپ کے کیا اعتراضات ہیں، اس وقت تک میں کیونکر قلم اٹھا سکتا ہوں؟ اب تک مثنوی پر جو اعتراض آپ نے کیا ہے وہ یہ ہے کہ اس میں حافظ شیرازی کی بے حرمتی کی گئی ہے لیکن جب تک اصولی بحث نہ ہو یہ معلوم نہیں ہو سکتا کہ میں حافظ پر تنقید کرنے میں کہاں تک حق بجانب ہوں۔

حضرت امام ربانی مجدد الف ثانی نے مکتوبات میں ایک جگہ یہ بحث کی ہے کہ گستن اچھا ہے یا پیوستن؟ یعنی فراق اچھا ہے یا وصال؟ میرے نزدیک گستن عین اسلام ہے اور پیوستن رہبانیت یا ایرانی (غیر اسلامی) تصوف ہے، اور میں اسی غیر اسلامی تصوف کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرتا ہوں۔ گذشتہ علمائے اسلام نے بھی ایسا ہی کیا ہے اور اس بات کی تاریخی شہادت موجود ہے۔

آپ کو یاد ہوگا جب آپ نے مجھے "سرالوصال" کا لقب دیا تھا تو میں نے آپ کو لکھا تھا کہ مجھے "سرالفراق" کہا جائے۔ اس وقت بھی میرے ذہن میں یہی امتیاز تھا جو حضرت مجدد الف ثانی نے کیا ہے۔ آپ کے تصوف کی اصطلاح میں اگر میں اپنے مذہب کو بیان کروں تو یہ ہوگا کہ شانِ عبدیت انتہائی کمال روحِ انسانی کا ہے، اس سے آگے اور کوئی مرتبہ نہیں ہے۔ یا ابن عربی کے الفاظ میں "عدم محض" ہے۔ یا بالفاظ دگر یوں کہہ سکتے ہیں کہ حالتِ سکر منشائے اسلام اور قوانینِ حیات دونوں کے خلاف ہے، اور حالت صحو جس کا دوسرا نام اسلام ہے۔ قوانینِ حیات کے عین مطابق ہے اور خود آنحضرت صلعم کا منشا بھی یہی تھا کہ ایسے لوگ پیدا ہوں جن کی حالت "کیفیتِ صحو" ہو یہی وجہ ہے کہ آپ کے صحابہ میں ہمیں "صدیق اکبرؓ" اور "فاروقِ اعظم" تو ملتے ہیں لیکن "حافظ شیرازی" کوئی نظر نہیں آتا۔

یہ مضمون بہت طویل ہے اس خط میں نہیں سما سکتا ان شاء اللہ اس پر مفصل بحث کروں گا۔ جب حالات مساعدت کریں گے۔ شیخ ابنِ عربیؒ کے ذکر سے ایک بات یاد آگئی جس کو اس لیے بیان کرتا ہوں کہ آپ کو غلط فہمی نہ رہے میں شیخ کی عظمت اور فضیلت دونوں کا قائل ہوں اور ان کو اسلام کے بہت بڑے حکماء میں سے سمجھتا ہوں مجھ کو ان کے اسلام میں بھی شک نہیں ہے کیونکہ جو عقائد ان کے ہیں (مثلاً قدم ارواح اور وحدت الوجود) ان کو انہوں نے فلسفہ کی بنا پر نہیں جانا بلکہ نیک نیتی سے قرآن حکیم سے مستنبط کیا ہے پس ان کے عقائد صحیح ہوں یا غلط قرآن کی تاویل پر مبنی ہیں یہ دوسری بات ہے کہ جو تاویل انھوں نے پیش کی ہے وہ منطقی یا منقول اعتبار سے صحیح ہے یا غلط؟ میرے نزدیک ان کی پیش کردہ تاویل یا تفسیر صحیح نہیں ہے اس لیے گو میں ان کو ایک مخلص مسلمان سمجھتا ہوں، مگر ان کے عقائد کا پیرو نہیں ہوں۔

اصل بات یہ ہے کہ صوفیا کو توحید اور وحدت الوجود کا مفہوم سمجھنے میں بڑی غلطی ہوئی ہے۔ یہ دونوں اصطلاحیں مترادف نہیں ہیں مقدم الذکر کا مفہوم مذہبی ہے اور مؤخر الذکر کا مفہوم خالص فلسفیانہ ہے توحید کی ضد کثرت نہیں ہے جیسا کہ بعض صوفیا سمجھتے ہیں بلکہ شرک ہے۔ ہاں وحدت الوجود کی ضد کثرت ہے۔ اس غلطی کا نتیجہ یہ ہوا کہ جن لوگوں نے وحدۃ الوجود یا زمانۂ حال کے فلسفۂ یورپ کی اصطلاح میں توحید کو ثابت کیا وہ موحد تصور کیے گئے۔ حالانکہ ان کے ثابت کردہ مسئلہ کا تعلق مذہب سے بالکل

نہ تھا۔ بلکہ نظامِ عالم کی حقیقت سے تھا (یعنی یہ کہ اس کائنات کا وجود حقیقی نہیں ہے)

اسلام کی تعلیم نہایت صاف اور واضح اور روشن ہے یعنی یہ کہ عبادت کے لائق صرف ایک ذات ہے۔ باقی جو کچھ کثرت عالم میں نظر آتی ہے وہ سب کی سب مخلوق ہے: گو علمی اور فلسفیانہ اعتبار سے اس کی حقیقت ایک ہی کیوں نہ ہو۔ چونکہ صوفیا نے فلسفہ اور مذہب کے دو مختلف مسائل (وحدت الوجود اور توحید) کو ایک ہی سمجھ لیا اس لئے ان کو یہ فکر لاحق ہوئی کہ توحید کو ثابت کرنے کا کوئی اور طریق ہونا چاہئے جو عقل اور ادراک کے قوانین سے تعلق نہ رکھتا ہو، اس غرض کے لئے حالتِ سُکر ممد و معاون ہوتی ہے اور یہ ہے اصل مسئلہ حال و مقامات کی۔ مجھے حالتِ سُکر کی واقعیت سے انکار نہیں ہے انکار صرف اس بات سے ہے کہ جس غرض کے لیے یہ حالت پیدا کی جاتی ہے وہ غرض اس سے مطلق پوری نہیں ہوتی۔ زیادہ سے زیادہ صاحب حال کو ایک عملی مسئلہ کی تصدیق ہو جاتی ہے نہ کہ مذہبی مسئلہ کی (یعنی حالت سُکر یا جذب و مستی میں سالک کو اس بات کا علم ہو جاتا ہے کہ واقعی کائنات میں اللہ کے سوا اور کسی کا وجود نہیں ہے) صوفیا نے وحدۃ الوجود کی کیفیت کو محض ایک مقام لکھا ہے اور شیخ اکبر کے نزدیک یہ انتہائی مقام ہے۔ اس سے آگے "عدم محض" ہے۔ لیکن یہ سوال کسی صوفی کے دل میں پیدا نہیں ہوا کہ آیا یہ مقام حقیقتِ نفس الامری کو بھی واضح کرتا ہے یا نہیں؟

اگر کثرت حقیقتِ نفس الامری ہے تو یہ کیفیتِ وحدۃ الوجود جو سالک پر طاری ہوتی ہے، محض دھوکہ ہے اور مذہبی یا فلسفیانہ اعتبار سے اس کی کوئی وقعت نہیں ہے۔ نیز اگر یہ کیفیتِ وحدۃ الوجود محض ایک مقام ہے اور کسی حقیقتِ نفس الامری کا اس سے انکشاف نہیں ہوتا تو پھر اس کو معقول طور سے ثابت کرنا بھی بے سود ہے، جیسا کہ ابن عربی اور ان کے متبعین نے کیا ہے اور نہ اس کے مقام ہونے کی بنا پر ہمیں روحانی زندگی میں کوئی فائدہ حاصل ہو سکتا ہے۔ کیونکہ قرآنی تعلیمات کی روشنی میں یا اس کی رو سے وجود فی الخارج (کائنات) کی ذات باری کے ساتھ اتحاد یا عینیت کی نسبت نہیں ہے بلکہ مخلوقیت کی نسبت ہے (یعنی خدا خالق ہے اور کائنات مخلوق ہے اور خالق اور مخلوق کے مابین مغائرت ہوتی ہے) اگر قرآن کی تعلیم یہ ہوتی کہ ذات باری تعالیٰ کثرتِ نظامِ عالم میں دائر و ساری ہے تو کیفیتِ وحدۃ الوجود کو قلب پر وارد کرنا مذہبی زندگی کے لیے نہایت مفید ہوتا۔ بلکہ یہ کیفیت مذہبی زندگی کی آخری منزل ہوتی۔

مگر میرا عقیدہ یہ ہے کہ یہ قرآن کی تعلیم نہیں ہے (یعنی قرآن کی رو سے خالق اور مخلوق یا عابد اور معبود میں مغائرت کُلی ثابت ہوتی ہے) اس کا نتیجہ ظاہر ہے کہ میرے نزدیک یہ کیفیت قلبی یا مذہبی اعتبار سے کوئی فائدہ نہیں رکھتی اور علم الحیات کی رو سے یہ ثابت کیا جا سکتا ہے کہ اس کیفیت کا ورود، ملی اعتبار سے بہت مضر ہے، مگر علم الحیات کی رو سے اس پر بحث کرنا بہت فرصت چاہتا ہے فی الحال اس خط کو ختم کرتا ہوں۔ اور اس طویل سمع خراشی کی معافی چاہتا ہوں۔ فقط

آپ کا خادم
محمد اقبال

اس خط کا ایک ایک لفظ نقل کرنے کا مقصد یہی ہے کہ خود اقبال کی زبان سے وحدۃ الوجود کی اسلامی اور غیر اسلامی تعبیر کو سمجھ جائے اور یہ حقیقت واضح ہو جائے کہ اقبال ہرگز تصوف کے مخالف نہیں تھے بلکہ وہ رہبانیت کو مسلمانوں کے دماغ سے نکالنا چاہتے تھے

"یوں تو قرآن و سنت اور اسوۂ رسولِ کریم (علیہ الصلوٰۃ والسلام) ہی ہماری تاریخ کا سرچشمہ ہے اسی سے ہماری قومیت اور اسی سے ہماری تہذیب اور اسی سے ہمارے افکار و علوم اور حیاتِ اجتماعی کا آغاز ہوتا ہے پھر بھی اقبال کا ایک قریبی عہد ماضی بھی تھا۔ غالباً یہ کوئی بڑا انکشاف نہیں کہ اقبال نے روحانی رہنمائی دو بڑے رہنماؤں سے حاصل کی۔ اوّل رومی سے دوسرے "حضرت مجدد الف ثانی" سے۔ اقبال براہ راست حضرت مجدد سے منسلک ہیں اور اور اسی دینی انقلاب کے داعی ہیں جو حضرت مجدد کے پیش نظر تھا۔

اردو فارسی شاعری میں اقبال کی خصوصی اہمیت یہ ہے کہ ان کا عرضۂ فکر ان کے شعری اور فلسفیانہ ذوق کی مناسبت سے دوسروں کے مقابلے میں وسیع ہے جہاں دوسرے قریبی اور وقتی جذبوں کو پیشِ نظر رکھتے ہیں وہاں اقبال نے دائمی اقدار کی تبلیغ کی ہے۔

دائمی اقدار کے معنی ہیں۔ خدا کی بادشاہتِ مطلق کا اقرار اور انسان کا خود اپنے اوپر ایمان لانا، اپنے اوپر ایمان لانے کا مطلب یہ ہے کہ انسان برحق ہے اور زمین پر خدا کا نائب یا خلیفہ ہے۔

یہ خالص درویشانہ تصور ہے کہ جب بھی کوئی شخص اپنے آپ کو پہچاننے کی کوشش کرتا ہے تو اس کی نظر اپنے خالق پر جا کر رک جاتی ہے اور پھر وہ اپنے آپ کو بھول کر سارے عالم کی تسخیر کر کے خدا کے نام کی گواہی دیتا ہے۔ شجاعت، عدالت اور صداقت جیسی صفات کو اپنا کر یقین محکم عمل پیہم اور محبت فاتح عالم جیسی اقدار کی تبلیغ کرتا ہے اور اپنے بعد بھی کسی "مردِ مومن" یا "شاہین" کی تلاش میں رہتا ہے جو اس کی اقدار کو اس کے بعد دنیا سے روشناس کراتا رہے

ع اے بندۂ مومن تو کجائی؟ تو کجائی؟

اپنے مسلک کا تعین کرنے سے پہلے سنہ ۱۹۱۰ء سے سنہ ۱۹۱۲ء تک علامہ اقبال کا کلام ان کی ذہنی کشمکش کا غماز ہے مثلاً:-

ترا اے قیس کیوں کر ہو گیا سوزِ دروں ٹھنڈا
کہ لیلیٰ میں تو ہیں اب تک وہی اندازِ لیلائی
نہ تخمِ لالہ تیری زمینِ شور سے پھوٹا!
زمانہ بھر میں رسوا ہے تری فطرت کی نازائی

(سنہ ۱۹۱۰ء)

امتیں اور بھی ہیں ان میں گنہگار بھی ہیں — عجز والے بھی ہیں مستِ مے پندار بھی ہیں
ان میں کاہل بھی ہیں غافل بھی ہیں ہشیار بھی ہیں — سینکڑوں ہیں کہ ترے نام سے بیزار بھی ہیں
رحمتیں ہیں تری اغیار کے کاشانوں پر
برق گرتی ہے تو بیچارے مسلمانوں پر (سنہ ۱۹۱۲ء)

کافروں کی مسلم آئینی کا بھی نظارہ کر — اور اپنے مسلموں کی مسلم آزاری بھی دیکھ
ساز عشرت کی صدا مغرب کے ایوانوں میں سن — اور ایران میں ذرا ماتم کی تیاری بھی دیکھ (سنہ ۱۹۱۱ء)
وائے ناکامی متاعِ کارواں جاتا رہا — کارواں کے دل سے احساسِ زیاں جاتا رہا

سطوتِ توحید قائم جن نمازوں سے ہوئی — وہ نمازیں ہند میں نذرِ برہمن ہو گئیں

آبرو باقی تری ملت کی جمعیت سے تھی ۔۔۔ جب یہ جمعیت گئی دنیا میں رسوا تو ہوا

خوب ہے تجھ کو شعارِ صاحبِ یثرب کا پاس ۔۔۔ کہہ رہی ہے زندگی تیری کہ تو مسلم نہیں

۱۹۱۳ء

اس نتیجے پر پہنچنے کے بعد کہ مسلمان اپنی ڈگر سے ہٹ گئے ہیں، اقبالؔ نے قرآن مجید کا مطالعہ شروع کیا تاکہ یہ معلوم ہوسکے کہ کتاب اللہ قوموں کی زندگی اور ترقی کے لئے کیا اصول بیان فرماتی ہے۔ اس زمانے میں حضرت علامہ کی زندگی کا جو حال ہم تک پہنچا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مرحوم تہجد کی نماز کے بعد قرآنِ حکیم کی تلاوت کیا کرتے تھے اور اس کی آیات میں تدبر اور تفکر کا نتیجہ یہ نکلتا تھا کہ کتابِ مقدس کے اوراق ان کے آنسوؤں سے تر ہو جاتے تھے۔ چنانچہ مرحوم کا وفادار خادم علی بخش ہر روز ان کے اوراق کو دھوپ میں سکھایا کرتا تھا۔

قرآنِ حکیم کے مطالعے سے یہ حقیقت ان پر واضح ہوگئی تھی کہ یہ سراسر عمل صالح یعنی جہاد کی تعلیم دیتا ہے۔ بلکہ نجاتِ آخروی کے علاوہ دنیاوی سربلندی کو بھی اسی مشغلے سے وابستہ کرتا ہے۔ مسلمانوں کی زندگی کا وہ قبل ازیں مطالعہ کرچکے تھے کہ ان میں عمل صالح کے علاوہ اور سب کچھ تھا تو اب جو سوال علامہ کے سامنے پوری شدت اور سنجیدگی کے ساتھ آیا۔ وہ یہ تھا کہ کس چیز نے قوم کی قوتِ عمل کو فنا کردیا؟

کافی غور و فکر کے بعد ان پر یہ حقیقت منکشف ہوئی کہ غیر اسلامی تصوف نے مسلمانوں کو ذوقِ عمل سے محروم کردیا۔ غیر اسلامی تصوف سے مراد وحدۃ الوجود کی وہ تعبیر ہے جس کی رو سے خدا اور انسان میں کوئی فرق باقی نہیں رہتا۔ ظاہر جب کسی انسان کا خواہ وہ ہندو ہو یا مسلمان یہ عقیدہ ہوگا کہ:۔

(۱) میں موجود نہیں بلکہ موہوم یا معدوم ہوں یعنی میرا وجود سراسر دھوکہ اور فریب ہے تو وہ جد وجہد یا عمل صالح کی طرف کیسے راغب ہوسکتا ہے؟

(۲) یہ کائنات میں جو کچھ نظر آتا ہے یہ سب خدا ہے۔ بالفاظ دیگر میں بھی خدا ہوں تو پھر وہ شخص خدا کی عبادت یا اطاعت کس طرح کرسکتا ہے؟

(۳) جب فرد کی ہستی باطل ہوگئی اور اس کے وجود ذاتی کی نفی ہوگئی، تو اخلاقی ذمہ داری کا احساس کیسے پیدا ہوسکتا ہے۔ اور جب اخلاقی ذمہ داری مٹ جائے تو دین یا مذہب کیسے باقی رہ سکتا ہے۔؟

اتنی بات تو اقبالؔ سے پہلے مولانا حالیؔ اور لسان العصر اکبرؔ نے بھی واضح کردی تھی کہ مسلمانوں کے زوال کا باعث یہ ہے کہ انھوں نے قرآنِ مجید کو ترک کردیا ہے لیکن یہ نہیں بتایا کہ کیوں ترک کردیا ہے؟ اس بات کو اقبالؔ نے ہم پر واضح کیا اور اس کی تفصیل یہ ہے کہ قرآنِ مجید فرماتا ہے کہ:۔

(۱) انسان معدوم یا موہوم نہیں ہے بلکہ موجود ہے اگر وہ یا اس کا وجود دھوکا یا فریب ہوتا تو اللہ تعالیٰ اسے زمین میں خلیفہ کیسے بنا سکتا تھا! خلافت پر فائز ہونے کے لئے انسان کا موجود ہونا پہلی شرط ہے:۔

نائبِ حق در جہاں بودن خوش است ۔۔۔ بر عناصر حکمراں بودن خوش است

نائبِ حق ہمچو جانِ عالم است ۔۔۔ ہستیِ او ظلِ اسمِ اعظم است

(اسرارِ خودی)

(۲) انسان اور خدا میں اسی طرح فرق ہے جس طرح زمین و آسمان میں فرق ہے۔ اللہ تعالیٰ خالق ہے اور معبود ہے، انسان مخلوق ہے اور عابد ہے۔ اگر خدا اور انسان دونوں ایک ہوں تو پھر عبادت کون کرے گا اور کس کی عبادت ہوگی؟

(۳) ہر انسان اپنی نجات و فلاح کا خود ذمہ دار ہے۔ وہ ایک دانا بینا توانا ہستی ہے۔ جسے اللہ نے نیکی اور بدی دونوں کے راستے دکھا دیے ہیں۔ اور اس بات کی آزادی عطا کی ہے کہ جو راستہ چاہے اختیار کرے، لہٰذا اقبالؔ "حدیثِ سوز و سازِ زندگی" بیان کرتے ہوئے

رہنمائی فرماتے ہیں کہ کونسا راستہ اختیار کیا جانا چاہئے۔

خدائے لم یزل کا دستِ قدرت تو زباں ہے
یقیں پیدا کر اے غافل کہ مغلوبِ گماں تو ہے

پرے ہے چرخ نیلی فام سے منزل مسلماں کی
ستارے جس کی گردِ راہ ہوں وہ کارواں تو ہے

مکاں فانی مکیں آنی ازل تیرا ابد تیرا
خدا کا آخری پیغام ہے تو جاوداں تو ہے

حنا بندِ عروسِ لالہ ہے خون جگر تیرا
تیری نسبت براہیمی ہے معمارِ جہاں تو ہے

تیری فطرت امیں ہے ممکناتِ زندگانی کی
جہاں کے جوہرِ مضمر کا گویا امتحاں تو ہے

جہانِ آب و گل سے عالم جاوید کی خاطر
نبوت ساتھ جس کو لے گئی وہ ارمغاں تو ہے

یہ نکتہ سرگذشتِ ملت بیضا سے ہے پیدا
کہ اقوامِ زمینِ ایشیا کا پاسباں تو ہے

سبق پھر پڑھ صداقت کا عدالت کا شجاعت کا
لیا جائے گا تجھ سے کام دنیا کی امامت کا

اس تفصیل سے معلوم ہو سکتا ہے کہ ویدانتی یا غیر اسلامی تصوف قرآن حکیم کی ضد ہے۔ چونکہ مسلمانوں نے اول الذکر اختیار کر لیا اس لیے وہ آخر الذکر سے قدرتی طور پر برگشتہ یا بے گانہ ہو گئے۔ جب ایک آدمی تاریکی اختیار کرے گا تو لامحالہ روشنی سے محروم ہو جائے گا، چنانچہ علامہ اقبالؔ نے اسرارِ خودی کے پہلے ایڈیشن کے ساتھ ایک مختصر اور بامعنی مقدمہ لکھا تھا جسے دوسرے ایڈیشن میں حذف کر دیا گیا تھا، مقدمے میں وہ خود فرماتے ہیں:۔

"مختصر یہ کہ ہندو حکمائ (خصوصاً شری شنکر اچاریہ) نے مسئلہ وحدت الوجود کے اثبات میں دماغ کو اپنا مخاطب بنایا۔ مگر ایرانی شعراء نے اس مسئلے کی تفسیر میں زیادہ خطرناک طریق اختیار کیا یعنی انھوں نے دل کو اپنی آماجگاہ بنایا۔ اور ان کی حسین و جمیل نکتہ آفرینیوں کا آخر کار یہ نتیجہ نکلا کہ اس مسئلے نے عوام تک پہنچ کر تمام اسلامی قوم کو ذوقِ عمل سے محروم کر دیا۔

جب علامہ اقبالؔ پر یہ حقیقت منکشف ہو گئی کہ قوم کی بربادی کا سبب نفی خودی کا غیر اسلامی عقیدہ ہے تو انہوں نے اپنے دل و دماغ کی ساری قوتوں کو اثبات یا خودی کے اسلامی عقیدہ کی اشاعت کے لئے وقف کر دیا، اس کارنامے نے ان کو عہدِ حاضر کا عظیم المرتبہ اسلامی مفکر، حکیم الامت ترجمانِ حقیقت، مجددِ ملت اور اسلامی انقلاب کا سب سے بڑا داعی بنا دیا۔

انھوں نے اسرارِ خودی اور رموزِ بیخودی اس لیے لکھی کہ مسلمان عشقِ رسولؐ کی بدولت اپنے اندر اس قدر طاقت اور قوت پیدا کر لیں کہ "عالم نو" کی تخلیق کر سکیں۔

پس خدا بر ما شریعت ختم کرد
بر رسولِؐ ما رسالت ختم کرد

رونق از ما محفلِ ایام را
او رسل را ختم و ما اقوام را

خدمتِ ساقی گری با ما گذاشت
داد ما را آخرین جامے کہ داشت

لا نبیَّ بعدی ز احسانِ خداست
پردۂ ناموسِ دینِ مصطفےٰ است

قوم را سرمایۂ قوت ازو
حفظِ سرِّ وحدتِ ملت ازو

حق تعالیٰ نقشِ ہر دعوےٰ شکست
تا ابد اسلام را شیرازہ بست

دل ز غیر اللہ مسلماں بر کند
نعرہ لاقوم بعدی می زند (رموزِ بیخودی)

اللہ تعالیٰ نے صاف لفظوں میں یہ اعلان فرمادیا ہے:۔

ھُوَ الَّذِیْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَہٗ بِالْھُدٰی وَ دِیْنِ الْحَقِّ لِیُظْھِرَہٗ عَلَی الدِّیْنِ کُلِّہٖ وَلَوْ کَرِہَ الْمُشْرِکُوْنَ ۹ : ۳۳

ترجمہ (وہ اللہ ہی تو ہے جس نے بھیجا اپنے رسول کو ہدایت اور دینِ حق کے ساتھ، تاکہ وہ اس کو تمام ادیانِ عالم پر غالب کردے، اگرچہ یہ فعل مشرکوں کو تو ضرور ناگوار گذرے گا۔)

اس آیت کا ایک ایک لفظ روزِ روشن کی طرح واضح ہے اور کسی تفسیر کا محتاج نہیں کہ دینِ اسلام ساری دنیا کے خلاف چیلنج ہے اس لیے ہر مسلمان کا فرض ہے کہ وہ اس دین کو دنیا کے تمام ادیان پر غالب کردے اور چونکہ یہ کام صرف اسی صورت میں وقوع پذیر ہو سکتا ہے کہ ساری دنیا کے مسلمان مل کر اظہارِ دین کے لیے جدوجہد کریں، اس لیے ہر مسلمان کا پہلا فرض یہ ہے کہ وہ اجتماعی زندگی بسر کرنا سیکھے اور یہی وجہ ہے کہ فاروق اعظمؓ نے مسلمانوں کو یہ نصیحت فرمائی کہ "لا اسلامَ الّا بالجماعۃ" یعنی جماعت سے علیحدہ رہ کر کوئی شخص مسلمان نہیں رہ سکتا۔

فاروقِ اعظم اور اقبال دونوں نے یہ تعلیم قرآن حکیم کی اس آیت سے اخذ کی ہے۔

خلاصۂ کلام یہ کہ "رموزِ بیخودی" میں اقبال نے قرآن حکیم کی اسی آیتِ شریفہ کی تفسیر کی ہے:۔
اللہ تعالیٰ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو ہدایت اور دینِ حق کے ساتھ بھیجا ہے تاکہ آپ اس دین کو تمام ادیانِ عالم پر غالب کردیں۔ لہذا ہم دیکھتے ہیں کہ علامہ مرحوم نے مثنوی "رموزِ بیخودی" کسی شخص سے منسوب کرنے کی بجائے ملتِ اسلامیہ کی خدمت میں پیش کی اور انھیں نصیحت فرمائی کہ حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے نقشِ قدم پر چلتے ہوئے ایک مرتبہ پھر تبلیغ دین کے مسلک کو زندہ کریں:۔

رمزِ سوز آموز از پروانۂ
در شرر تعمیر کن کاشانۂ

طرحِ عشق انداز اندر جانِ خویش
تازہ کن با مصطفےٰ پیمانِ خویش

یہ بہترین ہدیہ ہے جو کسی مسلمان نے اپنی قوم کی خدمت میں پیش کیا۔ انھیں چیزوں کو دیکھتے ہوئے ہم کہہ سکتے ہیں کہ اقبال نے درویشوں کی دنیا میں ایک مسلک کی بنیاد رکھی اور اعلان کردیا۔

خدا کے عاشق تو ہیں ہزاروں بنوں میں پھرتے ہیں مارے مارے
میں اس کا بندہ بنوں گا جس کو خدا کے بندوں سے پیار ہوگا

اور خدا کے بندوں سے پیار کرنے کا اس سے بہتر طریقہ اور کوئی نہیں ہو سکتا کہ ان کو خدا کے دین کی طرف راستہ دکھایا جائے۔
موضوعاتِ "رموزِ بیخودی" پر اگر ایک اجمالی نظر ڈالی جائے تو اس کے عنوانات خود اپنی زبان سے شہادت دیتے ہیں کہ طریقت شریعت سے علیحدہ کوئی چیز نہیں یعنی شریعت کی مثال شمع کی سی ہے جو راستہ دکھاتی ہے جب انسان اس پر عمل پیرا ہوتا ہے تو اس کا چلنا طریقت ہے گویا حقیقی تصوف عین اسلام ہے اور چونکہ اسلام کا مقصود یہ ہے کہ مسلمان اللہ تک پہونچ جائے، اس لیے اسلام عین تصوف ہے۔

در شریعت معنی دیگر مجو
غیر ضو در باطنِ گوہر مجو

این گہر را خود خدا گوہرگر است
ظاہرش گوہر بطونش گوہر است

دوسری بات جس پر اقبال وقتاً فوقتاً زور دیتے رہے وہ یہ ہے کہ سنت نبوی پر وہی شخص عامل ہو سکتا ہے جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت کرتا ہو کیونکہ اتباعِ رسولؐ بدون محبت محال ہے:۔

علم حق غیر از شریعت ہیچ نیست
اصل سنت جز محبت ہیچ نیست

علامہ اقبال اپنے اس مسلک کے پرزور مبلغ تھے کہ "فقر" ایک ایسی صفت ہے جو خداوند تعالیٰ اپنے ان مولا صفت بندوں کو عطا کرتا ہے جنھیں انسانیت کی حقیقی رہبری کا شرف حاصل ہوتا کہ وہ اسے اپنی ذات میں جذب کر کے منشائے خداوندی یعنی عدل کے نفاذ اور خیر کی توسیع کا ذریعہ بنائیں

خاکی و نوری نہاد، بندۂ مولا صفات
غالب و کار آفریں کارکشا، کارساز

مولانا صلاح الدین احمد اپنے مضمون "اقبال کا تصورِ فقر" میں یوں رقمطراز ہیں:۔

"قرآن حکیم نے جہاں کہیں فقر کا ذکر کیا ہے اسے التزاماً مسکنت اور رہبانیت سے متمیز کیا جاتا ہے کہ فقر کا نہ اول الذکر سے کوئی واسطہ ہے نہ ثانی الذکر سے کوئی علاقہ ـ مسکنت جو مذلت کی ہمدم اور ہم قدم ہے، ان افراد و اقوام کے حصے میں آئی جنھوں نے ادنیٰ تخلیقاتِ الٰہی جامد اسباب و اشیاء کو اپنا معبود بنالیا اور اسی کے لئے مرمٹے اور رہبانیت انھیں نصیب ہوئی جو مسخرات و موجوداتِ عالم پر قبضہ کرنے کی تاب نہ لاسکے اور انعام و اکرام خداوندی کے ادنیٰ مظاہر کو بھی اپنے ظرفِ تنگ میں جگہ نہ دے سکے پہلا گروہ حرص و نامرادی اور دوسرا فریق نااہلی و ناسپاسی سے منسوب ہو کر نہ صرف قدرت کے عطیاتِ عالیہ سے محروم رہا بلکہ اس مقصود کا بھی احساس نہ کر سکا جو انسان کا وہبی اور طبعی حق ہے اور جسے رضائے الٰہی نے اس کے لیے مقرر کیا تھا لیکن جن نفوسِ قدسی کو فقر کی دولت مل گئی وہ اس عالمِ اسباب میں نیابتِ خداوندی کے منصبِ جلیل پر فائز ہوئے اور اس کی اعلیٰ و ادنیٰ بخششوں کو اس کی راہ میں صرف کر کے منشائے ربانی کی تکمیل کا باعث بنے:۔ اولٰئک ھم المفلحون و اولٰئک ھم الفائزون۔

حضور سرورِ کائنات کی حیاتِ طیبہ از اول تا آخر آیۂ فقر کی تفسیر ہے اور بمنزلہ اس مصور کے ہے جہاں سے چشمۂ فقر پھوٹا ہے۔ حضور اس عالم کون و مکان میں پہلے انسان ہیں جو بیک وقت فقیر بھی تھے اور بادشاہ بھی اور جن کا فقر شہنشاہی کی زینت اور جن کی شہنشاہی فقر کی قوت تھی۔"

بقول علامہ:۔

فقر و شاہی واردات مصطفیٰ است
این تجلی ہائے ذات مصطفیٰ است
این دو قوت از وجود مومن است
این قیام و آن سجود مومن است
فقر ذوق و شوق و تسلیم و رضا است
ما امینیم، این متاع مصطفیٰ است

اگرچہ اسرار و رموز، بانگِ درا، اور پیام مشرق کی تصنیف کے زمانے میں اقبال کے ذہن میں فقر کا اصطلاحی مفہوم جاگزیں نہیں ہوا تھا کیونکہ ان کتابوں میں انھوں نے اول تو فقر کا لفظ بہت ہی کم استعمال کیا ہے اور اگر کہیں کیا بھی ہے تو لغوی معنی میں کیا ہے یعنی احتیاج یا مفلسی کے

معنوں میں لیکن اسرار و رموز اور پیامِ مشرق کی منازل پر پہنچ کر ان کا کاروانِ سخن نئے شوقِ سفر سے آشنا ہو چکا تھا۔ یہ اقلیم دل کے سفر کا شوق تھا اور مقصود تھا معرفتِ نفس، اپنے آپ، اپنے قویٰ، اپنے امکانات اور اپنے مقصود سے شناسائی "ہی تکمیلِ فقر" ہے اس لیے یہ منازل تصورِ فقر کی ارتقائی منازل کا درجہ رکھتی ہیں، بہ الفاظ دیگر اقبال کا مردِ خود آگاہ اور مردِ مومن اور ان کے مردِ درویش اور ان کا احساسِ خودی منصبِ فقر کے احساس کا ہم معنی ہے اسرار و رموز کے اوراق سر بسر اسی راز کی تفسیر سے معمور ہیں اور "پیامِ مشرق" میں جابجا فقر اور مقاماتِ فقر کے جمالی اور جلالی پہلو۔ جمالی کم تر اور جلالی بیشتر ایک طرفہ تازگی اور نادر بیانی سے پیش کیے گئے ہیں

"زبورِ عجم" میں انھوں نے پہلی مرتبہ اس لفظ کو اصطلاحی معنی میں استعمال کیا ہے، لیکن صرف ایک یا دو مرتبہ گویا ۱۹۲۷ء میں اس لفظ کا اصطلاحی مفہوم ان کے دماغ میں پیدا تو پیدا ہو گیا تھا لیکن اس کے نقوش بخوبی نمایاں نہیں ہوئے تھے۔

آن فقر کہ بے تیغے صد کشور دل گیرد
از شوکتِ دارا بہ، از فرِ قریدون بہ

اقبال نے فقر کا اصطلاحی مفہوم اس حدیث سے اخذ کیا ہے "اَلْفَقْرُ وَفَخْرِیْ" یعنی حضورِ انور صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں کہ میرے لیے اگر کوئی بات قابلِ فخر و مباہات ہو سکتی ہے تو وہ صرف یہ ہے کہ مجھ میں شانِ فقر بدرجہ اتم پائی جاتی ہے، یعنی میں ابدیت کے اعتبار سے اس مقام پر ہوں جہاں تمام بلندیاں ختم ہو جاتی ہیں، علامہ اقبال نے "جاوید نامہ" کے مندرجہ ذیل شعر میں حضور اکرمؐ کی اس خصوصیت کو یوں واضح کیا ہے۔

عبد دیگر، عبدۂ چیزے دگر
ما سراپا انتظار، او منتظر

"جاوید نامہ" میں جو ۱۹۳۲ء میں شائع ہوا، انہوں نے پہلی مرتبہ اس اصطلاح کی وضاحت کی، یعنی اس کا مفہوم ۱۹۲۱ء میں ان پر پورے طور سے منکشف ہوا لیکن دو ہی شعر لکھے ہیں۔

جز بقرآن ضیغمی روباھی است — فقرِ قرآن اصلِ شاہنشاھی است
فقرِ قرآن؟ اختلاطِ ذکر و فکر — فکر را کامل ندیدم جز بہ ذکر

دوسرے شعر سے یہ ثابت ہوا کہ فقر کے عناصرِ ترکیبی انھوں نے قرآنِ حکیم کی اس آیت سے حتمی اور اذعانی طور پر اخذ کیے ہیں۔

اَلَّذِیْنَ یَذْکُرُوْنَ اللّٰہَ قِیَامًا وَّقُعُوْدًا وَّعَلٰی جُنُوْبِھِمْ وَیَتَفَکَّرُوْنَ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۚ رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ ھٰذَا بَاطِلًا ۚ

ترجمہ (عقلمند لوگ وہ ہیں جو یاد کرتے ہیں اللہ تعالیٰ کو کھڑے اور بیٹھے اور لیٹے (یعنی ہر حال میں ہر وقت) اور غور و فکر کرتے ہیں آسمانوں اور زمین (کائنات) کی تخلیق میں (اور جب وہ غور و فکر کی بدولت اس کے مصالح سے آگاہ ہوتے ہیں تو بے اختیار پکار اٹھتے ہیں کہ) اے ہمارے رب! تو نے اس کائنات کو بے فائدہ پیدا نہیں کیا۔)

اور چونکہ عقیدۂ فقر اقبال کی تعلیمات یا ان کے پیغام کی روح ہے اس لیے ہم کہہ سکتے ہیں کہ اقبال نے دنیا کو اپنی شاعری کے پردے میں قرآنِ حکیم ہی کا درس دیا ہے۔

"جاوید نامہ" کی تصنیف کے بعد اقبال نے اپنی ساری توجہ قرآنی فقر میں تدبر و فکر پر مبذول کر دی اور "مسافر" میں جو ۱۹۳۴ء میں شائع ہوئی، انھوں نے

اس گوہرِ درخشاں کے مختلف پہلوؤں کو اپنے کلام میں پہلی مرتبہ واضح طور پر بیان کیا یعنی یہ حقیقت کہ دین اسلام دراصل فقر کا دوسرا نام ہے۔ ان پر وفات سے صرف پانچ سال پہلے منکشف ہوئی۔

"مسافر" اقبال مرحوم کی مختصر ترین تصنیف ہے بقول شیخ سعدی "اگرچہ بلقامت کہتر ولی بقیمت بہتر" اگر بدرجۂ اتم کسی کتاب پر صادق آسکتا ہے تو وہ یہی کتاب ہے، جس کے ہر شعر میں زندگی کی حرارت جلوہ گر ہے بلکہ حقایق و معارف کے دریا بہ رہے ہیں، اس کتاب میں اقبال نے حکیم سنائی کی زبان سے فقر کی حقیقت آشکار کی ہے، عنوان ہے :- "روحِ حکیم سنائی از بہشتِ بریں جواب می دہد"

راز دانِ خیر و شر گشتم ز فقر — زندہ و صاحبِ نظر گشتم ز فقر
یعنی آن فقرے کہ داند راہ را — بیند از نورِ خودی اللہ را
اندرونِ خویش جوید لا الہ — در تہِ شمشیر گوید لا الہ

یعنی فقر کی بدولت خودی میں اس قدر طاقت پیدا ہو جاتی ہے کہ مومن اللہ کو دیکھ سکتا ہے اور اربابِ دانش سے یہ حقیقت مخفی نہیں ہے کہ دین دراصل دیدار ہی کا دوسرا نام ہے :-

گفت دینِ عاشقاں ؟ گفتم شنید
گفت دینِ عارفاں ؟ گفتم کہ دید

"مسافر" کے بعد بالِ جبریل ۱۹۳۵ء میں "ضربِ کلیم" جولائی ۱۹۳۶ء میں مثنوی "پس چہ باید کرد" نومبر ۱۹۳۶ء میں اور ارمغانِ حجاز اکتوبر ۱۹۳۸ء میں (وفات سے ۶ ماہ بعد) شائع ہوئی، ان تمام کتابوں میں اقبال نے فقر ہی کا نغمہ دنیا کو سنایا ہے اور اسی کے مختلف گوشوں کو بے نقاب کیا ہے۔

مثنوی "پس چہ باید کرد" میں عقیدۂ فقر کی وضاحت کے لیے ایک مستقل باب اسی نام سے باندھا ہے مثلاً :-

چیست فقر اے بندگانِ آب و گل — یک نگاہِ راہ بین، یک زندہ دل
فقرِ کار خویش را سنجیدن است — بر دو حرفِ لا الہ پیچیدن است
فقرِ خیبر گیر با یارانِ شعیر — بستۂ فتراک او سلطان و میر

عقیدۂ فقر کے بعد عقیدۂ وحدۃ الوجود علامہ اقبال کا پسندیدہ موضوع ہے۔ واضح ہو کہ جسے شریعت کی اصطلاح میں مقام عبدیت کہتے ہیں اسی کو اسلامی تصوف کی اصطلاح میں مقام وحدۃ الوجود کہتے ہیں۔ بالفاظ دگر اس مقام سے دراصل عبدیت ہی کا کمال مطلوب ہوتا ہے یعنی اللہ تعالیٰ کی مرضیات اور احکام کے سامنے نہ صرف دنیا اور نفس کی خواہشات فنا ہو جائے کہ حق تعالیٰ کے مقابلے میں اپنا یا خلق کا وجود سرے سے نظر ہی نہ آئے، چنانچہ حکیم الامۃ حضرت مولانا تھانوی فرماتے ہیں کہ یہی وہ کیفیت ہے جس کو اہل فن نے وحدۃ الوجود کہا ہے۔ وہ معنی نہیں جو عوام میں مشہور ہیں کہ میں بھی خدا، تو بھی خدا، در و دیوار اور شجر و حجر بھی خدا۔ یہ بات بالکل غلط ہے۔ اور بعضے یہ سمجھتے ہیں کہ خدا کے سوا کوئی شے موجود نہیں ہے۔ یہ بھی بالکل غلط اور قرآن و حدیث کے بالکل خلاف ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔

"اَللّٰہُ خَالِقُ کُلِّ شَیْءٍ وَّھُوَ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ وَّکِیْلٌ"

ترجمہ :- "اللہ ہی ہے پیدا کرنے والا ہر چیز کا اور وہی ہر چیز کا نگہبان ہے۔"

مسلک علامہ اقبال کے مطابق وحدۃ الوجود کا مطلب یہ ہے کہ حقیقی اور ذاتی وجود جس کو حقیقی معنوں میں وجود کہنا چاہیے صرف حق تعالیٰ کا ہے۔

یہ حقیقت کہ اقبالؒ وحدۃ الوجود کے قائل ہیں، اگرچہ بجائے خود مبرہن ہے لیکن میں نے اس جگہ اس کی صراحت اس لیے کی ہے کہ اقبالؒ کی زندگی میں ایک دور ایسا بھی آیا ہے جب کہ وہ شیخ اکبر کے مخالف تھے۔ لیکن جب انھوں نے ربط حادث بالقدیم کے مسئلہ پر خالی الذہن ہو کر غور کیا تو اس کا حل ان کو صرف وحدۃ الوجود ہی ملا۔ اس کی تفصیل یہ ہے کہ ان کے کلام کا استقصاء کیا جائے تو یہ معلوم ہو سکتا ہے کہ:۔

ابتداء سے کر ۱۹۱۰ء تک اقبالؒ وحدۃ الوجود کے حامی اور قائل رہے۔ جیسا کہ بانگ درا کی نظموں سے ظاہر ہے۔

۱۹۱۰ء سے ۱۹۱۸ء تک دور ایسا ہے جب وہ یہ سمجھتے تھے کہ شیخ اکبرؒ بھی اسی وحدۃ الوجود کی تعلیم دیتے ہیں جو قرآن حکیم کے خلاف ہے لہٰذا وہ شیخ اکبر سے بدظن تھے اور وحدۃ الوجود کے مخالف تھے، لیکن جب انھوں نے بطور خود تحقیق کی تو انھیں معلوم ہوا کہ شیخ اکبر کا فلسفہ قرآن و حدیث ہی سے مطابقت رکھتا ہے تو انھوں نے اس مسلک کو بطیب خاطر قبول کر لیا، اور ۱۹۱۸ء سے ۱۹۳۸ء تک تا دمِ وفات وہ اسی مسلک کی تبلیغ کرتے رہے مثلاً:۔

(۱) جنھیں میں ڈھونڈتا تھا آسمانوں میں زمینوں میں
وہ نکلے میرے ظلمت خانۂ دل کے مکینوں میں　　　(بانگِ درا)

(۲) چشمِ غلط نگر کا یہ سارا قصور ہے　　　عالم ظہورِ جلوۂ ذوقِ شعور ہے
صیاد آپ، حلقۂ دامِ ستم بھی آپ　　　بامِ حرم بھی، طائرِ بامِ حرم بھی آپ
میں حسن ہوں کہ عشق سراپا گداز ہوں　　　کھلتا نہیں کہ ناز ہوں یا نیاز ہوں　　　(بانگِ درا)

(۳) کرا جوئی؟ چرا در پیچ و تابی　　　کہ او پیداست تو زیرِ نقابی
تلاشِ او کنی جز خود نہ بینی　　　تلاشِ خود کنی جز او نیابی　　　(پیامِ مشرق)

(۴) بغیرت آرمیدم تو بجوشِ خود نمائی　　　بکنارہ بر فگندی درِ آبدارِ خود را　　　(زبورِ عجم)

(۵) لا الٰہ تیغ و دمِ او عبدہٗ　　　فاش تر خواہی بگو ہو عبدہٗ　　　(جاوید نامہ)

(۶) از ضمیرِ کائنات آگاہ اوست　　　تیغِ لا موجود الا اللہ اوست　　　(مسافر)

(۷) چمک سورج میں کیا باقی رہے گی　　　اگر بیزار ہو اپنی کرن سے　　　(بالِ جبریل)

(۸) خودی کا سرِّ نہاں لا الٰہ الا اللہ　　　خودی ہے تیغ، فساں لا الٰہ الا اللہ　　　(ضربِ کلیم)

(۹) اگر ہو تجھے الجھن تو کھول کر کہہ دوں　　　وجودِ حضرتِ انساں نہ روح ہے نہ بدن　　　(ضربِ کلیم)

(۱۰) فقرِ مومن چیست؟ تسخیرِ جہات　　　بندہ از تاثیرِ او مولیٰ صفات　　　(پس چہ باید کرد)

(۱۱) چساں مومن کند پوشیدہ را فاش　　　ز لا موجود الا اللہ دریاب　　　(ارمغانِ حجاز)

ان تمام اشعار میں اقبالؒ نے وحدۃ الوجود کی وہ تعبیر پیش کی ہے جسے اصطلاح میں ہمہ از اوست یا ہمہ از دست کہتے ہیں۔ ان متفرق اشعار کے علاوہ "گلشنِ راز جدید" میں انھوں نے از اوّل تا آخر اسی مسلک کی تبلیغ کی ہے۔ مذکورہ کتاب کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں علامہ اقبال نے بے کم و کاست لا موجود الا اللہ کی تعلیم دیتے ہوئے خالص اسلامی "وحدۃ الوجود" کی حقیقت کو واضح کیا ہے۔

جیسا کہ نام سے ظاہر ہے علامہ مرحوم نے یہ کتاب شیخ محمود شبستری کی مشہور تصنیف "گلشنِ راز" کے جواب میں لکھی، "گلشنِ راز" شیخ اکبر کے فلسفۂ وحدۃ الوجود کی تشریح ہے۔

یہ کتاب اقبال نے خاص طور پر ان لوگوں کے لئے لکھی ہے جو اپنی کم علمی یا نا واقفیت کی بنا پر ویدانتی اور اسلامی نظریۂ وحدۃ الوجود میں فرق نہیں کر سکتے اور اس لیے اس کے ثمرات سے محروم رہتے ہیں۔ تفصیل اس کی یہ ہے کہ:۔

شنکر اچاریہ کا نظریۂ وحدۃ الوجود انسان کو نفیٔ خودی (فنائے کلی) ترکِ سعی و عمل اور ترکِ عالم (رہبانیت) کی تعلیم دیتا ہے اور یہ سب باتیں انسان کو جہادِ فی سبیل اللہ سے باز رکھتی ہیں جو قرآن حکیم کی رو سے انسان کا مقصدِ حیات ہے۔ بالفاظِ دیگر وحدۃ الوجود کا ویدانتی نظریہ سراسر قرآنی تعلیمات کے خلاف ہے۔

اس کے برعکس شیخ اکبر کا نظریۂ وحدۃ الوجود چونکہ قرآن و حدیث پر مبنی ہے اسلئے وہ نہ فنائے کلی کی تعلیم دیتا ہے اور نہ ترکِ عمل اور ترکِ دنیا کا سبق پڑھاتا ہے کیونکہ یہ باتیں روحِ اسلام کی ضد ہیں بلکہ مسلمان کو اس حقیقت سے آگاہ کرتا ہے۔ ؎

(۱) قدم بیباک تر نہ در رہِ زیست — بہ پہنائے جہاں غیر از تو کس نیست

(۲) سخن از بود و نابودِ جہاں با من چہ می گوئی — من ایں دانم کہ من ہستم نہ دانم ایں چہ نیرنگ است

(۳) وجودِ کوہسار و دشت و در ہیچ — جہاں فانی خودی باقی دگر ہیچ

اس تعلیم سے حسب ذیل دو خوشگوار نتیجے برآمد ہوتے ہیں۔

پہلا نتیجہ یہ کہ جب ایک مسلمان کو اس حقیقت سے آگاہی ہو گئی کہ یہ کائنات ہیچ ہے، فانی ہے، باطل ہے، مٹ جانے والی ہے، بے ثبات ہے تو وہ ہرگز اس کو مقصودِ حیات نہیں بنا سکتا۔

دوسرا نتیجہ یہ کہ جب ایک مسلمان پر یہ حقیقت منکشف ہو گئی کہ ساری کائنات میں اللہ کے سوا کوئی ہستی حقیقی معنی میں موجود نہیں ہے تو وہ نہ کسی ہستی سے ڈر سکتا ہے اور نہ کسی کے آگے دستِ سوال دراز کر سکتا ہے۔

اربابِ علم اس حقیقت سے بخوبی واقف ہیں کہ جہاد فی سبیل اللہ پر وہی شخص آمادہ ہو سکتا ہے جو دنیا کو ہیچ یقین کرتے ہوئے خداوند تعالیٰ کو قادرِ مطلق سمجھے۔ یہی تعلیم ہے جو اقبال جوانانِ قوم کو دینا چاہتے تھے چنانچہ اسی مقصد کے پیشِ نظر انھوں نے گلشن راز کا جواب لکھا۔

"گلشن راز" جیسا کہ میں نے ابھی واضح کیا ہے شیخ اکبر کے فلسفۂ وحدۃ الوجود کی تشریح ہے شیخ محمود نے ان سوالات کا جواب فلسفہ کے بجائے خالص وحدۃ الوجود کی روشنی میں دیا ہے، وجہ یہ ہے کہ اگر سوالات کی نوعیت کو مدنظر رکھا جائے تو صاف معلوم ہو سکتا ہے کہ سائل نے یہ سوالات فلسفۂ تصوف ہی سے متعلق کیے ہیں مثلاً:

"اندر خود سفر کن" "مردِ تمام" "سرِ وحدت" "عارف" "انا الحق" "وصالِ ممکن و واجب" "جزو کل" "طریق جستن" یہ سب فلسفۂ تصوف کی اصطلاحیں ہیں۔

اقبال نے اگرچہ پندرہ سوالات میں سے گیارہ سوالات کے جوابات دیے ہیں۔ مگر یہ جوابات بھی وحدۃ الوجود ہی کی روشنی میں لکھے ہیں، اس سے ثابت ہوا کہ اقبال بھی شیخ محمود کی طرح اسی مسلک پر عامل ہیں اور اسی کو حق سمجھتے ہیں چند مثالیں پیشِ خدمت ہیں:۔

۱۔ شیخ محمود شبستری:۔

در آ در وادیٔ ایمن زمانی — شنو انّی انا اللہ بیگمانی

علامہ اقبال — اگر زیری ز خود گیری زبر شو — خدا خواہی؟ بخود نزدیک تر شو

۲۔ ہمہ عالم بنورِ اوست پیدا — کجا او گردد از عالم ہویدا (محمود شبستری)

درونِ شیشۂ او روزگار است — دلی بر ما بتدریج آشکار است (علامہ اقبال)

(۳) چو ہست مطلق آمد را شارت — بلفظِ من کنند آنرا عبارت (محمود شبستری)
بجو مطلق دریں دیر مکافات — کہ مطلق نیست جز نور السمٰوات (علامہ اقبال)

(۴) اَلَسْتُ بِرَبِّکُمْ ایزد چرا گفت — کہ بود آخر کہ آن ساعت بلیٰ گفت (محمود)
الست از خلوتِ نازے کہ برخاست — بلیٰ از پردۂ سازے کہ برخاست (اقبال)

مماثلتِ فکر و نظر کی بہت سی مثالیں مل سکتی ہیں، لیکن دعویٰ کے اثبات کے لیے اتنی ہی کافی ہیں۔

جس طرح انھوں نے وحدت الوجود کی اسلامی (قرآنی) تعبیر کی تبلیغ کی ہے، اسی طرح اس نظریہ کی غیر اسلامی (ویدانتی) تعبیر کی تردید کی ہے

دگر از شکر و منصور کم گوی
خدا را ہم براہ خویشتن جوی

شکر کے نظریہ سے انسان کا مقصدِ حیات یہ ہے کہ وہ اپنی خودی کو خدا کی ذات میں اس طرح گم (فناء) کر دے کہ اس کا وجود باقی نہ رہے۔ یعنی قطرہ سمندر ہو جائے، لیکن اقبال اس کے برعکس فرماتے ہیں۔

بہ بحرش گم شدن انجام ما نیست
اگر اورا تو در گیری فنا نیست

خطباتِ مدارس میں بھی علامہ اقبال نے جا بجا اسی حقیقت کو واضح کیا ہے:۔

"یہ دنیا اپنی تفصیلات میں سالمات مادی کی میکانکی یا غیر شعوری حرکت سے لیکر انسانی انا کی با اختیار اور بالارادہ حرکت تک، انائے اعظم (حق تعالیٰ) کا جلوۂ ذات ہے":۔

زمین و آسماں و چار سو نیست
در این عالم بجز اللہ ہو نیست

ان حقائق کی روشنی میں یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ علامہ اقبال بذاتِ خود ایک مردِ درویش تھے، البتہ یہ بھی حقیقت ہے:۔

اقبال کو بھی اقبال سے آگاہ نہیں ہے
کچھ اس میں تمسخر نہیں، واللہ نہیں ہے

لیکن ان کی ہر کتاب درویشانہ کیفیت کی غمازی کرتی ہے، بلکہ شعرِ اقبال میں اس رجحان کا آغاز اس کی شاعری کے اس دور سے شروع ہو چکا تھا جس نمائندگی "بانگ درا" کرتی ہے۔ ان کی نظم "شکوہ" شاہد ہے کہ اقبال اور خداوند تعالیٰ کے درمیان اپنائیت کا رشتہ قائم ہو چکا تھا کیونکہ "شکوہ" اپنوں سے کیا جاتا ہے، ہاں یہ درست ہے کہ اس مقام پر وہ ابھی حسن و عشق کی لطافتوں اور جذب و مستی کی کیفیتوں سے سرشار ہیں، اور گلزار ہست کو بود کی نیرنگیوں سے بیگانہ نہیں ہو سکے لیکن "اسرارِ خودی" میں ناظرانہ حد کو پار کر کے مفکرانہ حدود میں داخل ہوتے ہوئے "من عرف نفسہ" کے مقام پر نظر آتے ہیں۔ "رموزِ بیخودی" میں "فقد عرفہ ربہ" کے مقام سے شناسا ہوتے ہوئے "اسوۂ حسنہ" پر چلنے کی تلقین کرتے ہیں اور سورۂ اخلاص کی نئے انداز سے تفسیر بیان فرماتے ہیں۔

"زبورِ عجم" کی غزلیات بلند ترین حقایق و معارف کا دلکش نمونہ ہیں اور یوں معلوم ہوتا ہے کہ اس مقام پر وہ "عشقِ حقیقی" میں ڈوب چکے ہیں اور عارفانہ ذوق رکھنے والوں کو "بالِ جبریل" میں مشورہ دیتے ہیں۔

اگر ہو ذوق تو خلوت میں پڑھ زبورِ عجم
فغانِ نیم شبی، بے نوائے راز نہیں

"گلشنِ رازِ جدید" جو "زبورِ عجم" کی جان ہے وحدۃ الوجود کے فلسفے سے لبریز ہے اور اربابِ علم سے یہ حقیقت مخفی نہیں ہے کہ انسان کا دل جب تک سوز و گداز سے آشنا نہ ہو عشقِ حقیقی سے بہرہ اندوز نہیں ہو سکتا۔ اور جب تک دل میں معرفت کا ذوق کارفرما نہ ہو، انسان "وحدۃ الوجود" کی طرف مائل نہیں ہو سکتا۔

"زبورِ عجم" کے اکثر اشعار کوزہ میں دریا کے مصداق ہیں اور جب تک کوئی شخص خود ان مقامات سے واقفیت نہ رکھتا ہو وہ کس طرح ان حقیقتوں کا اعتراف کر سکتا ہے مثلاً فرماتے ہیں:-

چہ عجب اگر دو سلطان بولایتی نگنجد
عجب ایں کہ می نگنجد بدو عالمی فقیری

بقول مولانا صلاح الدین احمد:-

"زبورِ عجم کی یہ تفسیر دل افروز شاہد فقر کی جان جہاں آرا کا وہ منظر پیش کرتی ہے جسے اس کی تاب جلال نے آنکھوں سے چھپا رکھا تھا۔ اگرچہ بنیادی طور پر ان دونوں کیفیتوں کا مصدر ایک ہے۔ میری مراد فقر کامل سے ہے، جسے اقبال کا تصور کبھی حیدر کرار میں مجسم دیکھتا ہے، کبھی فاروق اعظم میں کبھی اسے بوذر میں اس کا جلوہ نظر آتا ہے کبھی سلمان میں کبھی وہ عالمگیر کی صورت اختیار کرتا ہے کبھی امام مالک کی۔

"جاوید نامہ" تک پہنچتے پہنچتے شاعر کے تصورِ فقر میں ایک عجیب و غریب براقی اور تیزی پیدا ہو گئی ہے، ایسا معلوم ہوتا ہے فقر ان کے ہاتھ میں ایک تلوار کی مانند ہے جس سے وہ کائنات کی تسخیر کیا چاہتا ہے۔

مختصر یہ کہ "جاوید نامہ" کا رنگ ہی کچھ اور ہے، جس میں شاعر نے افلاک اور آن سوئے افلاک دونوں کی سیر کی ہے بلکہ خدا سے بھی ملاقات کی ہے۔

ناگہاں دیدم جہانِ خویش را ... آن زمین و آسمانِ خویش را!
غرق در نورِ شفق گوں دیدمش ... سرخ مانندِ طبر خوں دیدمش!
زاں تجلی ہا کہ در جانم شکست ... چوں کلیم اللہ فتادم جلوہ مست!
نورِ او ہر پردگی را وا نمود ... تابِ گفتار از زبانِ من ربود!

چنانچہ خالقِ کائنات کے اس تحفہ سے آراستہ ہو کر جس "فقیر" نے اپنے معاشرے کی قیادت سنبھالی تھی سفرِ آخرت سے چند لمحے پہلے وہ اپنی حقیقت مندرجہ ذیل رباعی میں بیان کرتے کرتے خالقِ حقیقی سے جا ملے۔

سرودِ رفتہ باز آید کہ ناید
نسیمی از حجاز آید کہ ناید
سر آمد روزگارِ ایں فقیری
دگر دانائے راز آید کہ ناید

علامہ اقبال کا سفر دہلی ۱۹۰۵ء

لندن روانگی کے موقع پر

محمد ایوب قادری

جب اقبال اعلیٰ تعلیم کے لیے عازم یورپ ہوئے تو پہلے دہلی پہنچے حضرت شیخ المشائخ نظام الدین اولیاءؒ کے مزار اقدس پر حاضری دی۔ مرزا غالب کی قبر پر فاتحہ پڑھی۔ دہلی سے بمبئی گئے اور بمبئی سے لندن کی راہ لی۔ حضرت نظام الدین اولیاء کے مزار کی حاضری کی دلچسپ روداد خواجہ حسن نظامی نے اخبار "وکیل" امرتسر میں "ہمارا پردیسی" کے عنوان سے شائع کرائی جس کو مولوی انشاء اللہ ایڈیٹر "وطن" لاہور نے نقل کیا ہے۔ حضرت علامہ کی اسی حاضری کے تاثرات کو ملا واحدی نے "پرانی یادیں" کے عنوان سے "منادی" دہلی میں شائع کیا ہے۔ خوش قسمتی سے ہمیں یہ دونوں نوادر اور اس سلسلے کی ایک آدھ اور تحریر مل گئی ہے۔ ان تحریروں کو یہاں پیش کیا جاتا ہے۔

علامہ اقبال کی لندن روانگی کی اطلاع ایڈیٹر "وطن" نے مندرجہ ذیل الفاظ میں شائع کی۔

"شیخ محمد اقبال صاحب ایم اے انگریزی علم ادب کی تکمیل کے لیے تین سال کے واسطے یکم ستمبر کو لاہور سے انگلستان کو روانہ ہو گئے۔ دعا ہے کہ خداوند کریم ان کو بخیریت و کامیابی واپس لائے۔"[1]

اس کے بعد خواجہ حسن نظامی کی روداد ملاحظہ فرمایئے جس کو ایڈیٹر "وطن" لاہور نے وکیل امرتسر سے نقل کیا ہے "ہمارا پردیسی" کے عنوان حسن نظامی ہم عصر "وکیل" کو لکھتے ہیں:

"ہونہار فائق و فاتق ہندوستانی شیخ محمد اقبال ایم۔ اے ۲ ستمبر کو لندن سدھارا۔ خدا اُسے بامراد واپس لائے اور غریب ہندوستان کو اس کی ذات سے فائدہ حاصل کرنے کا موقع ملے۔"

۱۲ ستمبر کو صبح ۶ بجے دہلی اسٹیشن پر ہندی اقبال کا خیر مقدم کیا گیا تھا اس لیے کچھ دیر اپنے محب خاص مولوی نذیر محمد بی اے اسسٹنٹ انسپکٹر دارس حلقہ دہلی کے مکان پر توقف کر کے درگاہ شریف کی جانب روانہ ہو گئے۔ اگرچہ کھانے کا وقت آگیا تھا اور مولوی نذر محمد صاحب کی آرزو تھی کہ

---

[1] وطن لاہور مجریہ ۸ ستمبر ۱۹۰۵ء بروز جمعہ مطابق ۲۷ رجب ۱۳۲۳ھ موافق ۲۴ بھادوں سمبت ۱۹۶۲ جلد ۱ نمبر ۵ شمارہ ۳۵ ص ۸۔ کالم ۱۔

یہ قافلہ شکم سیری کے بعد کوچ کرے مگر اقبال نے لنگر محبوب کی سوکھی روٹیوں کو مکلف طعام پر ترجیح دی۔ اور کوچ کا سامان کر دیا۔

الغرض رمز شناس حقیقت، میر نیرنگ ساکن انبالہ، شیخ محمد اکرام نائب ایڈیٹر مخزن لاہور، مولوی نذر محمد، منشی نورالدین ڈرائنگ ماسٹر نارمل اسکول دہلی، حسن نظامی، اقبال وغیرہ کی جماعت دربار سلطانی میں حاضر ہوئی۔ ہم سب لوگ تو زیارت کر کے روضۂ مبارک کے باہر آگئے اور اقبال نے عین مزار شریف کے متصل کچھ دیر مراقبہ کیا اور اپنی نئی نظم "خاموشی کی صدائیں" پیش کی۔ اس کے بعد روضۂ مقدس کے سرہانے لوگوں کے حلقے میں بلند آواز اور اقبالی لحن میں اس نظم کو دوبارہ سنایا۔ اس وقت سامعین پر ایک خاص کیفیت طاری تھی۔ یہ نظم اقبال کی تمام نظموں میں ممتاز اور مخصوص سمجھی جانے کے قابل ہے۔ اس کا ایک حصہ حضرت محبوب الٰہی کی منقبت میں تھا، ایک اور حصے میں اپنے سفر کی غرض و غایت بیان کی تھی۔ اور یہ بھی ظاہر کیا تھا کہ وہ آئندہ کس قسم کی زندگی اختیار کرنا چاہتے ہیں۔ یہ نظم غالباً اکتوبر کے مہینے میں مخزن کے ذریعہ سے شائع ہوگی (مخزن تسلیم کیا جاتا ہے) میرے خیال میں یہ نظم اس قابل ہے کہ ہندوستان کا ہر اردو خواں باشندہ اس کو پڑھے اور نتائج پر غور کرے۔

زیارت سے فارغ ہو کر وہ خشک روٹی جو توشہ خانۂ حضرت محبوب الٰہی کی جانب سے فقرا اور درویشوں کو دی جاتی ہے ان سب گریجویٹ درویشوں نے خوشی خوشی مزے سے کھائی۔ پھر روحانی شراب یعنی سماع کا دور چلتا رہا اور ولایت خاں قوال نے خوب رنگ جمایا۔ اس قوال کو بھی حضرت محبوب الٰہی سے خاص واسطہ ہے۔ کیونکہ یہ حضرت صابری کی اولاد میں ہے جو حضرت محبوب الٰہی کے خاص اور پسندیدہ قوال تھے اب ان کی اولاد میں صرف ایک ہی گھر باقی رہ گیا ہے۔

قصہ مختصر چند ساعت کی چہل پہل کے بعد رخصت اور وداع کی تیاریاں ہونے لگیں۔ چلتے چلتے مرزا غالب کے مزار پر بھی گزر ہو گیا اور ایک ایسا نظارہ دیکھا، جو وفات غالب سے لے کر آج تک کسی نے نہ دیکھا ہوگا۔ جب ہم قبرستان کے احاطے میں داخل ہوئے سورج ڈھل چکا تھا۔ شاید ایک بجا ہوگا۔ دھوپ میں ناقابل برداشت تیزی تھی۔ اول چند مغل امرا کی قبروں کو پامال کرنا پڑا، جو مرقد غالب کے رستے میں حائل تھیں۔ اس کے بعد ہم خاک کے اس ڈھیر پر پہنچ گئے جس کے نیچے گنج معانی دفن ہے۔ مرزا غالب کا آدھا جسد ترہ مٹی میں پوشیدہ تھا۔ ہم اسی رخ ایک کچی دیوار کا تکیہ لگا کر بیٹھ گئے۔ یہ چھوٹی سی دیوار غالب کے دائیں پہلو میں اداس اور چپ چاپ کھڑی تھی۔ اس نے باوجود بے سروسامانی ہم پر سایہ ڈالا اور سونے والے غالب کی طرف سے میزبانی کی۔ نیرنگ و اقبال پر اس سین کا اتنا اثر تھا کہ افسردگی کے عالم میں خاموش سر جھکائے بیٹھے تھے ویسی ہی، اکرام، نذر محمد، نورالدین، حسن نظامی کی حالت تھی اور مزار کے گرد حلقہ بنائے بیٹھے تھے۔ یکایک ولایت کی سریلی اور مہین آواز میں غالب کی روح بولنے لگی۔ جس وقت ولایت نے غالب: یہ شعر پڑھا:

وہ بادۂ شبانہ کی سرمستیاں کہاں
اٹھیے بس اب کہ لذت خواب سحر گئی

سب پر از خود رفتگی کی کیفیت طاری ہو گئی۔ خاص کر اقبال جھوم جھوم کر شعر کی تکرار کرتے تھے اس پُر حسرت و پُر حسرت سین کا بہت جلد خاتمہ ہو گیا اور ہم غالب کو اکیلا چھوڑ کر چلے آئے۔ شب مولوی نذر محمد بی اے کے مکان پر بسر ہوئی۔ جو نہایت خلیق و متواضع آدمی ہیں۔ ۱۵ بجے بمبئی میل میں ہمارا پردیسی تین برس کے لیے ہم سے چھٹ گیا۔"

اب حضرت ملا واحدی کے تاثرات ملاحظہ کیجیے:

سنہ ۱۹۰۵ء کا ایک یادگار دن

جب اقبال حضرت سلطان المشائخ کی بارگاہ میں حاضر ہوئے

وہ بادۂ شبانہ کی سرمستیاں کہاں
اٹھیے بس اب کہ لذتِ خوابِ سحر گئی

مرزا غالب یہ کس کی سرمستیوں کا ذکر کر رہے ہیں۔ بادۂ شبانہ کی سرمستیاں کس پر چھائی تھیں اور پھر کس کا نشہ اُترا تھا۔ کس کی جوانی ڈھلی تھی اور کس کا لطفِ حیات گیا تھا۔ ان کا اپنا ذکر ہو، یا کسی اور کا، ذرا غور تو کیجیے، جس کا بھی ذکر ہے وہ آج لذتِ خوابِ سحر ہی سے نہیں۔ لذتِ خواب زندگی سے بھی محروم ہے۔ مرزا کو لذتِ خواب سحر جانے کا ملال تھا، یہاں لذت خواب زندگی بھی نہیں رہی۔

ڈیڑھ سو برس قبل یہی سب کچھ ہوتا ہوگا جو آج کل ہوتا ہے اور ہمیشہ سے ہوتا ہے۔ لیکن بقول میر نیرنگ، زمانے کی قینچی اسی طرح چلتی ہے کہ کترن تک کہیں پڑی نہیں چھوڑتی۔ پرانی باتیں جانے دیجیے، کل کی بات سنیے۔ میرے سامنے کی بات ہے لیکن یہ بھی داستانِ پارینہ ہے۔ اقبال ابھی شیخ محمد اقبال ایم اے ہیں اور بیرسٹری کی تعلیم اور فلسفے کی تکمیل کے لیے یورپ روانہ ہو رہے ہیں۔ ویسے اقبال کا نام اور کلام گھر گھر میں گونج رہا ہے۔ ان کی نظمیں ملک کے مقتدر رسالوں میں چھپتی ہیں اور داخلِ نصاب ہیں۔ ان کا یہ شعر بچے بچے کی زبان پر ہے۔

آتا ہے یاد مجھ کو گذرا ہوا زمانہ
وہ جھاڑیاں چمن کی، وہ میرا آشیانہ

ادبی اور علمی دنیا میں لاہور کے تین نوجوانوں کے متعلق چرچا تھا کہ پنجاب کو چار چاند لگائیں گے۔ ایک شیخ محمد اقبال، دوسرے شیخ عبدالقادر اور تیسرے ظفر علی خاں۔ اقبال سرِفہرست تھے۔ اب طبلِ اقبال بجنے کا دور آتا ہے۔ اب وہ بیرسٹری پاس کرنے اور فلسفے کا ڈاکٹر بننے یورپ جا رہے ہیں۔ لیکن یورپ جانے سے پہلے حضرت سلطان المشائخ، محبوبِ الٰہی، خواجہ نظام الدین اولیاء کے مزار پُرانوار پر حاضری دینی اور دعا مانگنی ضروری ہے۔

شیخ محمد اکرام، معاون مدیر مخزن لاہور ساتھ ہیں۔ راستے میں انبالے سے میر نیرنگ مشایعت کرتے ہیں اور دلی میں منشی نذر محمد انسپکٹر مدارس اور خواجہ حسن نظامی ہاتھوں ہاتھ لیتے ہیں۔ منشی نذر محمد کا مکان ریلوے اسٹیشن کے قریب ہے۔ تھوڑی دیر ان کے ہاں آرام کیا جاتا ہے۔ پھر پوری پارٹی حضرت سلطان المشائخ کی درگاہ آتی ہے۔ اقبال کی خواہش کے مطابق سب گنبد کے دروازے کے پاس رک جاتے ہیں۔ اقبال تنہا گنبد میں داخل ہوتے ہیں اور مزار کے سرہانے بیٹھ کر مندرجہ ذیل نظم پڑھتے ہیں:

فرشتے پڑھتے ہیں جس کو وہ نام ہے تیرا	بڑی جناب تری، فیض عام ہے تیرا
ترے وجود سے روشن ہے راہِ منزلِ شوق	دیارِ عشق کا مصحف کلام ہے تیرا
نہاں ہے تیری محبت میں رنگ محبوبی	بڑی ہے شان، بڑا احترام ہے تیرا

لہ وطن لاہور یوم ۲۴ دسمبر سنہ ۱۹۰۵ء مطابق ۲۲ رجب المرجب سنہ ۱۳۲۳ھ جلد ۵ نمبر ۳۷

ستارے عشق کے تیری کشش سے ہیں قائم — نظام مہر کی صورت نظام ہے تیرا
کرم کرم کہ غریب الدیار ہے اقبال — مرید پیر نجف ہے غلام ہے تیرا
اگر سیاہ دلم، داغ لالہ زار توام — دگر کشادہ جبینم گل بہار توام
کیا ہے تیرے مقرر نے مدح خواں مجھ کو — مجھے ہزار مبارک، مری زباں مجھ کو
بھلا ہو دونوں جہاں میں حسن نظامیؒ کا — ملا ہے جس کی بدولت یہ آستاں مجھ کو
مرے سفینے کو تو نے کنارہ بوس کیا — اماں نہ دیتا تھا جب بحر بیکراں مجھ کو
فلک نشیں صفت مہر ہوں زمانے میں — تری دعا سے عطا ہو وہ نردباں مجھ کو
رہوں میں خادم خلق خدا جیوں جب تک — نہیں ہے آرزوئے عمر جاوداں مجھ کو
قسم ہے اپنے دل دردمند کی آقا — تری ثنا کے لیے حق نے دی زباں مجھ کو
شگفتہ ہو کے کلی دل کی پھول ہو جائے — یہ التجائے مسافر قبول ہو جائے

تنہائی میں کیا کیفیت رہی ہو گی، اس کی خبر تو اقبال کو تھی یا اللہ کو، باہر آکر درگاہ کے صحن میں مزار کی طرف منہ کر کے نظم دوبارہ سنائی گئی تو انداز کے درد اور لہجے کی رقت سے تمام احباب اور دوسرے سامعین بے حد متاثر ہوئے اور بے اختیار آمین و آفرین پکار اٹھے۔ عجب عالم محویت تھا۔ جو اس دن وہاں موجود تھا وہی اس کا تصور کر سکتا ہے۔

درگاہ سے خواجہ حسن نظامی کے مکان گئے، کھانا کھایا۔ ولایت خاں مرحوم، دلی کا قوال، جس کی ابھی ابتدا ہی تھی مگر نو عمری ہی میں خوش گلو اور طبیعت دار تھا۔ گاتا رہا اور وقت گزرتا رہا۔ اس کے بعد شہر واپس ہوئے۔ واپسی میں پارٹی مرزا غالب کی قبر پر ٹھہری۔ میر نیرنگ قبر کی لوح کو پکڑے بیٹھے تھے۔ اقبال دائیں جانب عالم محویت میں تشریف فرما تھے۔ ستمبر کا مہینہ تھا، ہوا بند تھی اور دھوپ بڑی تیز، لیکن کسی کو گرمی کا احساس نہ تھا۔ ولایت بولا "حضور! اجازت ہو تو مرزا غالب کی غزل پیش کروں۔" سرود بہ مستاں یاد دہانیدن، یہاں کسے عذر تھا۔ چنانچہ اس نے کہنا شروع کیا:

دونوں کو اک ادا میں رضامند کر گئی — دل سے تری نگاہ جگر تک اتر گئی

غزل کے ان دو شعروں نے حاضرین میں ہلچل پیدا کر دی۔ دیکھیے کس قدر برمحل تھے۔

اڑتی پھرے ہے خاک مری کوئے یار میں — بارے اب اے ہوا، ہوس بال و پر گئی
وہ بادۂ شبانہ کی سرمستیاں کہاں — اٹھیے بس اب کہ لذت خواب سحر گئی

ولایت نے غزل ختم کی اور پارٹی ہوش بجا کر کے چلنے کے لیے اٹھی۔ اقبال نے جوش عقیدت میں غالب کی لوح مزار کو بوسہ دیا اور شہر کا راستہ لیا۔ آہ، اقبال اور اقبال کی صحبتیں بھی آج افسانہ ہیں اور ان افسانوں کو بیان کرنے والے خود عنقریب افسانہ ہوا چاہتے ہیں۔[1]

---

[1] ماہنامہ "منادی" دہلی، جلد ۳۹ شمارہ ۴۔

اقبال کے لندن پہنچنے کے بعد روداد سفر پر مشتمل ان کا ایک طویل خط "وطن"[1] لاہور میں شائع ہوا۔ اس خط کو منشی محمد دین فوق، ایڈیٹر "کشمیری میگزین" لاہور نے کشمیری میگزین میں نقل کیا اور علامہ اقبال سے ان کے "رشحات قلم" کی درخواست کی جس کا جواب علامہ نے ایک خط کی صورت میں مرحمت فرمایا۔ فوق مرحوم نے علامہ اقبال کا وہ خط (بصورت اقتباس) ایک تمہید کے ساتھ کشمیری میگزین میں شائع کر دیا جو درج ذیل ہے۔

"فخر قوم شیخ محمد اقبال صاحب ایم۔اے"

کشمیری میگزین کے پہلے نمبر بابت ماہ جنوری ۱۹۰۶ء میں "ولایتی چھٹی" کے عنوان سے محبی و مشفقی پروفیسر محمد اقبال صاحب کا ایک مضمون ایک "لوکل صحیفہ"[2] سے اقتباساً درج کیا گیا تھا بعض حضرات نے اعتراض کیا کہ شیخ صاحب کے مضامین دیگر اخبارات سے نقل نہ کئے جایا کریں بلکہ ان کو توجہ دلائی جائے کہ وہ براہ راست اپنے قومی میگزین کو بھی یاد فرمایا کریں۔ بعض اصحاب نے تو یہاں تک اشتیاق ظاہر کیا کہ میگزین کا ایک پرچہ بھی ان کی نظم یا نثر سے خالی نہ رہنا چاہیئے۔ ادھر تو مشتاقان کلام اقبال کو یہ کھٹکا گیا کہ وہ ولایت میں بغرض مضمون نگاری نہیں بلکہ بغرض تعلیم گئے ہیں اور وہ تعلیم میں وہاں اس قدر مصروف ہیں کہ ان پر فرمائشی نظم و نثر کا بوجھ ڈالنا نامناسب معلوم ہوتا ہے ادھر شیخ صاحب کی خدمت میں گزارش کی گئی کہ قوم کا بھی کچھ حق ہے۔ اگر کچھ وقت بچا کر کے تو قومی مخزن (میگزین) کو بھی یاد فرمایا کیجئے۔ اس عریضے کا جواب درج ذیل ہے:

"ڈیر فوق۔ آپ کا خط ملا۔ الحمد للہ کہ آپ خیریت سے ہیں۔ مجھے یہ خیال تھا کہ جاتی دفعہ کپ سے ملاقات نہ ہو سکی۔ افسوس ہے مجھے اس موقع پر فرصت کم تھی ورنہ کہیں نہ کہیں آپ سے ملنے کو آجاتا۔ اچھا ہوا کہ آپ نے وہ پرچہ (کشمیری میگزین) اپنی ذمہ داری پر چلانا شروع کیا۔ مجھے سخت افسوس ہے کہ یہاں کے مشاغل سے مطلق فرصت نہیں ملتی ایسے حالات میں مضامین لکھنے کی کہاں سوجھتی ہے البتہ شعر ہے جو کبھی کبھی خود بخود ہو جاتا ہے سو شیخ عبدالقادر (ایڈیٹر مخزن) لے جاتے ہیں۔ ان سے انکار نہیں ہو سکتا۔ آپ سے بھی انکار نہیں اگر کچھ ہو گیا تو حاضر ہو گا۔ والسلام

محمد اقبال
ٹرینٹی کالج، کیمبرج، انگلینڈ"[3]

---

[1] ہفتہ وار "وطن" لاہور مراد ہے۔ یہ خط ہفتہ وار "چٹان" لاہور میں شائع ہو چکا ہے۔

[2] ہفتہ وار "وطن" لاہور مراد ہے۔

[3] کشمیری میگزین (لاہور) بابت ماہ اپریل ۱۹۰۶ء جلد نمبر ۱ شمارہ ۴ ص ۲۲۔

پروفیسر حمید احمد خاں

سیّد سعید احمد

آخر ۲۲ مارچ ۱۹۷۴ء کو پروفیسر حمید خاں بھی قافلہ رفتگاں سے جا ملے ع

ہوا کے دوش پہ جاتا کاروانِ نفس
عدم کی راہ میں کوئی پیادہ پا نہ ہلا

حمید احمد خاں نے ۱۹۰۴ء میں پنجاب کے ایک علمی گھرانے میں آنکھ کھولی، ان کے والد ان اولین صحافیوں میں سے تھے جنھوں نے پنجاب کے عوام خصوصاً کسانوں کی فلاح و بہبود کے لئے "زمیندار" جاری کیا۔ یہی اخبار بعد میں مولانا ظفر علی خاں کی وجہ سے تحریک آزادیٔ ہند کا موثر ترین علم بردار ثابت ہوا۔ حمید احمد خاں بابائے صحافت ظفر علی خاں کے چھوٹے بھائی تھے۔ جب ظفر علی خاں اپنی تعلیم ختم کر کے حیدر آباد دکن گئے تو ان کے ساتھ ان کے چھوٹے بھائی (حمید احمد خاں) بھی تھے حمید احمد خاں نے ایم اے تک کی تعلیم جامعہ عثمانیہ سے حاصل کی بعد میں انگریزی میں ایم لٹ کی ڈگری کیمبرج یونیورسٹی سے لی۔ انھوں نے عملی زندگی کا آغاز اسلامیہ کالج میں انگریزی کے استاد کی حیثیت سے کیا بعد ازاں وہ اسی کالج کے پرنسپل ہو گئے کئی سال تک اس کالج میں پرنسپل رہنے کے بعد وہ پنجاب یونیورسٹی کے وائس چانسلر مقرر ہوئے لیکن بعد میں بعض وجوہ کی بنا پر مستعفی ہو گئے۔ ۱۹۶۹ء میں مجلس ترقی ادب لاہور کے ناظم مقرر ہوئے۔

پروفیسر حمید احمد خاں کی ذات کئی حیثیتوں سے ہمارے ملک کا قابل قدر اثاثہ تھی وہ اردو کے صاحب طرز ادیب تھے، اگرچہ ان کی تصانیف تعداد میں کم ہیں لیکن معیار کے اعتبار سے بلند ہیں۔ سیرت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم پر انھوں نے طالب علمی کے زمانے میں جو مقالہ لکھا تھا وہ اردو میں سیرت کی کتابوں میں بہت اہمیت رکھتا ہے اس مقالے پر ان کو یونیورسٹی کے انعام کا مستحق ٹھہرایا گیا تھا۔ جو تحقیقی اور علمی مقالات لکھنے والے طالب علموں کو دیا جاتا تھا۔ سیرت پر اس مقالے کو ان کے استاد مولانا مناظر احسن گیلانی نے بھی بہت پسند کیا تھا۔

غالب سے انھیں خاص دلچسپی تھی ۔۔۔ غالب کی حیات پر انھوں نے کئی مقالے لکھے جن میں عارت کی بہو بیگم صاحبہ" ان کا انٹرویو خاص اہمیت رکھتا ہے، پنجاب یونیورسٹی کے وائس چانسلر کی حیثیت سے انھوں نے غالب کی صد سالہ برسی کی تقریبات میں خاص

دلچسپی لی۔ اس موقع پر پنجاب یونیورسٹی نے غالب کی تمام تصانیف کے عمدہ ایڈیشن شائع کئے۔ یہ سب حمید احمد خاں کی غالب سے ذاتی دلچسپی کا نتیجہ تھا۔ مجلس ترقی ادب کے ناظم کی حیثیت سے انھوں نے متعدد اور اہم فکر انگیز کتابیں شائع کیں۔

حمید احمد خاں کی تالیفات میں "ارمغانِ حالی" کو خاص اہمیت حاصل ہے ہر عہد میں پرانے شعرا اور ادیبوں کو از سرِ نو دریافت کیا جاتا ہے "ارمغانِ حالی" میں انکی حالی کو دریافت کیا گیا ہے جو موجودہ دور میں ہمارا ساتھ دے سکتا ہے حالی کی نظم و نثر کا یہ انتخاب تفہیم حالی کے سلسلے کی اہم کڑی ہے۔

حمید احمد خاں کے مضامین اور خطبات کا مجموعہ "تعلیم و تہذیب" کے نام سے زیرِ طبع ہے اس میں مرحوم کے تمام تعلیمی و ثقافتی مضامین شامل ہیں۔

حمید احمد خاں کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ وہ اردو کے بے لوث سپاہی تھے انھوں نے زندگی بھر انگریزی تعلیم دی لیکن اردو سے انھیں بے پناہ محبت تھی اور وہ یہ چاہتے تھے کہ پاکستان میں اردو کو اس کا جائز مقام حاصل ہو جائے اور اس مقصد کے لئے انھوں نے عملی جد و جہد بھی کی۔

آخری دنوں میں حمید احمد خاں غالب اور اقبال پر دو کتابیں لکھ رہے تھے افسوس کہ ان کا یہ منصوبہ موت نے مکمل نہ ہونے دیا۔

انجمن کی جدید مطبوعات

۱۔ سلطنت عثمانیہ کی انقلابی تحریکیں	از مزمل یٰسین	قیمت آٹھ روپے
۲۔ ہمیشہ بہار (تذکرہ شعرائے فارسی از کشن چند اخلاص)	مرتبہ ڈاکٹر وحید قریشی	" پندرہ روپے
۳۔ انتخاب جدید (شعرائے عصر کا کلام)	مرتبہ پروفیسر عزیز احمد آل احمد سرور	" آٹھ روپے
۴۔ شمسون مبارز مصنف: جان ملٹن۔ مترجم مجنوں گورکھپوری		" چھ روپے
۵۔ سید باغ و دور مرزا اسد اللہ خاں غالب۔ تعارف امتیاز علی عرشی		" ایک روپیہ
۶۔ موج موج مہران (جدید سندھی شعرا کے منتخب کلام کا منظوم اردو ترجمہ) مترجم: الیاس عشقی مرتب: مراد علی مرزا		" بارہ روپے
۷۔ مثنوی کدم راؤ پدم راؤ مصنفہ نجم الدین نظامی مرتبہ جمیل جالبی		" ۲۵ روپے
۸۔ شاہان اودھ کے کتب خانے مترجمہ و مرتبہ محمد اکرام چغتائی		" آٹھ روپے
۹۔ لغت کبیر اردو جلد اول (اردو سے اردو) مؤلفہ بابائے اردو ڈاکٹر مولوی عبدالحق		" پندرہ روپے
۱۰۔ احساس کپیٹال جلد دوم از کارل مارکس ترجمہ سید محمد تقی		" پندرہ روپے
۱۱۔ پاکٹ ڈکشنری انگلش اردو ڈکشنری۔ بائبل پیپر		" چھ روپے

بچت سے خوشحالی ہے

اپنی بچت کو

قومی بچت کی اسکیموں میں لگائیے

- خاص ڈپازٹ سرٹیفکیٹ
- نیشنل ڈپازٹ سرٹیفکیٹ
- ڈیفنس سیونگ سرٹیفکیٹ
- انعامی بانڈ
- پوسٹ آفس سیونگ بینک
- پوسٹل لائف انشورنس

یہاں رقم تیزی سے بڑھتی ہے

قومی بچت کے مرکز، بینک یا ڈاک خانے سے خریدیئے

Regd. S. No. 1138
Monthly

QAOMI ZABAN

Phone : 232..
Karachi

اسٹینڈرڈ انگریزی اردو ڈکشنری

کے

نئے ایڈیشن

کی چند

خصوصیات

- یہ لغت اہل علم کی ایک جماعت کے تعاون سے تیار ہوئی۔ اس لیے اس کی جامعیت ، افادیت اور صحت مطالعہ کو درجۂ استناد حاصل ہے۔
- اس میں انگریزی زبان کے تمام مروجہ الفاظ کے معانی دیے گئے ہیں۔
- انگریزی الفاظ کے صرف اردو مترادفات درج کرنے پر ہی اکتفا نہیں کیا گیا بلکہ ضروری جگہوں پر الفاظ کی تشریح بھی کی گئی ہے۔
- اس بات کا پورا اہتمام کیا گیا ہے کہ انگریزی کے محاورے یا روز مرہ کے لیے اردو محاورہ یا روز مرہ ، انگریزی مثل کے لیے اردو مثل اس طرح درج کی جائے کہ انگریزی کا صحیح مفہوم پوری طرح ادا ہو جائے۔
- انگریزی الفاظ کے معانی کے نازک فرق بھی اردو مترادف الفاظ سے ظاہر کیے گئے ہیں۔ جن الفاظ کے مختلف اور متعدد معنی ہیں وہاں معانی کا نمبر شمار دیا گیا ہے تاکہ معانی کا امتیاز صاف طور پر نظر آ سکے۔ ہر معنی کا فرق مثالیں دے کر واضح کیا گیا ہے۔
- باطنی حسن کے ساتھ صوری اعتبار سے بھی یہ ایڈیشن اپنی مثال آپ ہے۔ اسے اعلیٰ درجے کے بائبل پیپر پر چھاپا گیا ہے۔ یہ کاغذ خاص طور پر اس ایڈیشن کے لیے درآمد کیا گیا ہے۔

قیمت : سالہ روپے

انجمن ترقی اردو پاکستان

بابائے اردو روڈ کراچی ۱

مدیر :- شبیر علی کاظمی- کلیم الحسن نقوی کے زیر اہتمام انجمن پریس کراچی میں چھپ کر انجمن ترقی اردو (پاکستان) - بابائے اردو روڈ- کراچی سے شائع ہوا۔